فہرست

مضمون نگارانِ معارف

(جلد ۱۳۱)

ماہ جنوری ۱۹۸۳ء تا ماہ جون ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۳۱)

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۳۱ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۳ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت کوئی ایسا رہنما نہیں جو ہندوستان کے ہر خطہ میں غیر معمولی اثر اور مقبولیت رکھتا ہو اس کی وجہ پر غور کرنا ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو قحط الرجال بتائی جائے گی، لیکن انفرادی قیادت اگر حاصل نہ ہو تو اجتماعی قیادت موثر ہو سکتی ہے، اجتماعی قیادت ایک اچھی تنظیم ہی کے ذریعہ بروئے کار آسکتی ہے، اچھی تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی شعور کا امالہ صحیح معنوں میں ہو، یہ امالہ کیسے ہو اور کون کرے؟ عام طور سے یہ خیال ہے کہ مسلمان مذہب کے نام پر ڈٹتا ہے اور یہ صحیح ہے، مذہبی جوش ابھار کر وہ کام لیا جاسکتا ہے جو مہلک اسلحہ سے نہیں ہو سکتا، قرونِ اولیٰ میں مذہب ہی کے نام پر مسلمان عرب کے ریگستان سے نکل کر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ گئے، مسلمان فرماں رواؤں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، وہاں اپنے نام کا جز یا "اللہ" یا "دین" ہی قرار دیا، اور گو ان کی حکومتیں خاندانی رہیں، لیکن انھوں نے ظل الٰہی یا اللہ کے مستنصر اللہ کے آمر اللہ کے قاہر یا دین کے قطب دین کے شمس، دین کے ظہیر دین کے ناصر دین کے محی، اور دین کی صلاح بن کر حکومت کرنا پسند کیا، گو ایسے القاب رسمی اور ظاہری ہی سہی، لیکن ان ہی القاب سے مسلمان عوام بلکہ خواص بھی خوش اور مجموعی حیثیت سے مطمئن رہے۔

ہندوستانی مسلمان بھی مذہب کے نام پر اینٹھتے رہے ہیں، اگر کہیں مسجد شہید ہو رہی ہو تو خدا جانے کتنے مسلمان جامِ شہادت نوش کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر حملہ آور ہو تو وہ سر بکف ہو کر میدانِ کارزار میں اتر آتے ہیں یا اگر ان کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی ہو تو ان کا خون ابل پڑتا ہے اور وہ ایسے اقدام کر بیٹھتے ہیں جو احتیاط اور تدبر کے منافی ہوتے ہیں۔

مگر یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ وہ مذہب کے نام پر تو مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ایک مذہبی عالم کو اپنا سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیں، ہندوستان میں گذشتہ سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ سیاست میں علما مسلمانوں کے ذہن پر چھا نہ سکے، سر سید احمد خان کی علی گڈھ تحریک کی مخالفت علماء کی طرف سے بڑے زور و شور سے ہوئی، مگر سر سید احمد خان اس مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے ہیرو بن کر نمودار ہوئے اور ان ہی کے نظر و فکر کے حامی سیاست پر چھائے رہے

مولانا ابو الکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کی ایمانی حرارت، مذہبی غیرت اور دینی بصیرت کو ایسی جلا دی کہ مسلمانوں میں از سر نو ذہنی تازگی پیدا ہو گئی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد جلا وطن ہو کر مالٹا میں قید کیے گئے، اور مولانا عبید اللہ سندھی طرح طرح کی صعوبتیں اٹھا کر یورپ میں پناہ لیے رہے مولانا عبد الباری فرنگی محلی تو غیر علماء لیڈروں کے مرشد بنے رہے، مگر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں سے کسی کو نہیں ہوئی۔

مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا حسین احمد کے وجود سے ہندوستان کی سرزمین کو بڑی برکت حاصل ہوتی رہی، مفتی کفایت اللہ کے فتاویٰ کے آگے سارے مسلمان جھکتے رہے، مولانا سجاد بہاری کی مساعی جمیلہ سے بہار کی مذہبی زندگی کو امارت شرعیہ کے ذریعہ سے بڑا سہارا ملا، مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور شیوا بیانی کو سننے کے لیے مسلمان جوق در جوق جمع ہوتے، مولانا حسین احمد کے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا حلقہ دیوبند سے آسام تک پھیلا ہوا تھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بہادرانہ اور دلیرانہ کارناموں کی یاد بھلائی نہیں جا سکتی، مگر پاکستان کی تحریک کے قائد اعظم محمد علی جناح ہی تسلیم کیے گئے، ان کی غیر مذہبی زندگی سے متعلق علماء کے سارے دلائل و براہین فضا میں گونج کر رہ گئے۔

اور پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ غیر علماء مسلمان لیڈروں میں مسلمانوں کا اپنا ذوق انتخاب کار فرما رہا، طیب جی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، تصدق احمد شروانی، نثار احمد شروانی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبد الغفار خان نے سیاست میں اپنی زندگی کو بڑے ایثار اور قربانی کا نمونہ بنایا، مگر وہ ہندوؤں کے حلقوں میں تو ضرور مقبول رہے، لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو اپنے سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا، آخر کیوں؟

محمد علی جناح نے میرے ایک عزیز دوست سے جو نجی گفتگو کی تھی، اس کو یہاں پر دہرانا برمحل ہوگا،

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں جب انھوں نے گاندھی جی سے بمبئی میں بارہ روز تک[۱۲] گفتگو جاری رکھی تو ایک روز گاندھی جی نے ان سے کہا کہ قائد اعظم! وہ کون سی بات ہے جس سے آپ نے مسلمانوں پر مسمریزم کر دیا ہے، محمد علی جناح نے جواب دیا: ہاں! میں نے ضرور ان پر مسمریزم کر دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں پنج وقتہ نماز کا پابند نہیں ہوں، روزے بھی نہیں رکھتا ہوں، میرے گلے میں تصوف کا کوئی مالا بھی نہیں، پھر بھی ان مسلمانوں نے مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کر لیا ہے، جانتے ہیں کیوں؟ یہ مسلمان اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے، میں ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا ہوں، اس لیے وہ مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کیے ہوئے ہیں، لیکن جس روز ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا چھوڑ دوں گا، میں جانتا ہوں کہ یہی قائد اعظم تسلیم کرنے والے مسلمان مجھ کو KICK out کر دیں گے۔

اصلی قیادت کی یہی شان ہوتی ہے کہ قائد اپنے معتقدیوں کے جذبات کی ترجمانی صحیح وقت پر صحیح طریقے کرے اور اگر اس کے معتقدیوں کے جذبات غلط طریقہ پر ابھریں تو ان کا صحیح ازالہ بھی کرے، اور اگر وہ صحیح ازالہ نہیں کرتا ہے تو اپنے ساتھ اپنے معتقدیوں کو بھی ذلت، تباہی اور بربادی کے غار میں جا گراتا ہے جس کی مثال نظام حیدر آباد کی ریاست کے سقوط کے زمانہ میں قاسم رضوی کی ذات اور قیادت میں ملتی ہے۔

ہمارے علما، اسلام کے پشتیبان ہیں، اس کے ناموس کے نگہبان ہیں، اس کی روایت کے حدی خواں ہیں، اور اس کے مستقبل کے رجز خوان ہیں، وہ سوچیں کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ مولانا مودودی اور مولانا نورانی کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمن پاکستانی سیاست پر چھا گئے، جناب مولانا مفتی محمود سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو زیادہ دنوں تک اس عہدہ پر نہیں رہ سکے، ہندوستان میں جماعت اسلامی اپنے جذبۂ خدمت و ایثار اور جمعیۃ العلماء اپنی مقدس آنی کے باوجود کبھی مسلمانوں میں وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں [illegible] ن کی تحریک کے زمانہ میں مسلم لیگ کو حاصل ہوئی، اس کی وجہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے، مسلمانوں کی محض بدبختی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

مقالات

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ

تعارف اور تجزیہ

از

ڈاکٹر مشیر الحق پروفیسر مطالعات اسلامی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

یہ مقالہ دار المصنفین کے اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا گیا، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مستشرقین کس طرح دور دراز قیاسات اور احتمالات بلکہ اپنی ذہنی ورزش سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں جس میں بہت کچھ ان کے خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، اسی کو محور بنا کر اپنے مقصد اور مطلب کی ترویج کرتے ہیں۔ "معارف"

ولفرڈ کینٹویل اسمتھ کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو کے ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی، ان کے والد مشہور پارکر قلم بنانے والی کمپنی کے ڈائرکٹر تھے، اس حقیقت واقعہ اور اسمتھ کے مسلسل تصنیفی شغف کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منہ میں چاندی کا چمچہ تو نہیں لیکن ہاتھ میں قلم ضرور لے کر اس دنیا میں آئے، وہ تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی، اسپینی اور سویڈش زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اسمتھ نے جس ٹورانٹو میں آنکھیں کھولی تھیں وہ اپنے تہذیبی اور مذہبی روایات میں آج کے ٹورانٹو سے بہت مختلف تھا، اس وقت وہاں کی عام شہری زندگی پر مذہب کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ اتوار کے دن بازار میں چائے کی ایک پیالی مل جائے تو لوگ خوش نصیبی سمجھتے تھے، ٹورانٹو بدل گیا لیکن اسمتھ کی مذہبیت میں تبدیلی نہیں آئی، مذہبی اقدار کی عملی پابندی کے معاملہ میں وہ آج بھی امریکہ میں رہتے ہوئے انیسویں صدی کی دنیا میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خوش ہیں، اسمتھ بے عمل اشخاص کے ساتھ رہ تو سکتے ہیں، لیکن زندگی نہیں گذار سکتے، انھیں دوسروں کی لامذہبیت سے اذیت ضرور پہونچتی ہے، لیکن ان کی مذہبی زندگی کو ناپنے کا معیار اسمتھ اپنے مذہب کو نہیں بلکہ اس مذہب کو قرار دیتے ہیں جس کی پیروی کے وہ دعویدار ہوتے ہیں۔

اسمتھ نے اپنی طالبعلمانہ زندگی ٹورانٹو، پرنسٹن اور کیمبرج کی تعلیم گاہوں میں گذاری، لیکن وہ جہاں بھی رہے ایک ممتاز طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے طالب علموں کی مذہب پسند تحریکوں میں بھی جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے، ان تحریکوں میں ان کا ساتھ جن دوسرے طلبہ وطالبات سے رہا، وہ بالعموم عیسائی مشنریوں کی اولادیں تھیں، اپنے انہی ساتھیوں میں سے ایک خاتون موریل میکنزی اسٹروتھرز کو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنی شریک حیات بنالیا، ۱۹۴۱ء میں ان کا تقرر "فارمن کرسچین کالج لاہور" میں استاد کی حیثیت سے ہوا، جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک مقیم رہے، ان کی علمی زندگی میں ہندوستان کا یہ چھ سالہ قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے، "ہندوستانی اسلام" کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد انھیں اپنے اس خیال کی صداقت کا پورا یقین ہوگیا کہ اسلام صرف مشرق وسطی کی سرحدوں میں محدود نہیں ہے، اور برصغیر کو نظر انداز کرکے اسلام کا مکمل مطالعہ ممکن نہیں ہے، انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" یہیں کے دوران قیام ۱۹۴۳ء میں شائع کی جس کا شمار آج بھی نیم کلاسکی ادب میں کیا جاتا ہے، وہ اس وقت تک تاریخ کے

تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے، اس کی اشاعت کے بعد مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انھیں مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا۔

ہندوستان آنے سے پہلے وہ کیمبرج میں ہملٹن گب کی نگرانی میں دو سال تک عربی اور اسلامیات کا مطالعہ کر چکے تھے، یہاں سے واپسی پر انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے. حتی کی نگرانی میں "مجلۃ الازہر تجزیہ وتنقید" کے موضوع پر مقالہ پیش کرکے پی. ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۴۹ء میں وہ کمپیریٹیو ریلیجن کے پروفیسر ہوکر میکگل یونیورسٹی چلے آئے، جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی، میکگل آنے کے پانچ چھ برس کے اندر ہی ان کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" شائع ہوئی جس نے ان کو پورے عالم اسلام میں متعارف کرادیا، لیکن اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد وہ صرف اسلام کو اپنا موضوع مطالعہ بنانے کے بجائے دنیا کے مختلف مذاہب، بلکہ نفس مذہب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہوگئے، انھوں نے مانٹریال ریڈیو سے "دوسروں کا مذہب" کے عنوان سے تعارفی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں "THE FAITH OF OTHER MEN" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا، ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مختلف مذاہب پر اپنی تحقیقات کا نچوڑ "مذہب کا مطلب ومنتہا" ("THE MEANING AND END OF RELIGION") کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی، جب انھوں نے محسوس کیا کہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا میدان ان کے ذہنی سفر کے لیے تنگ ہوگیا ہے، [illegible]ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کے مرکز کے ڈائرکٹر ہوکر چلے گئے، میکگل انسٹی ٹیوٹ چونکہ اسلام کے مطالعہ کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے دوران قیام اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم کی نسبت نصف نصف رہے

کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی مذہب کا مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کی غیر موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا، ہارورڈ میں چونکہ ایک سے زیادہ مذاہب کا مطالعہ مقصود تھا، اس لیے وہاں پر انھوں نے سنٹر کو آفاقی بنیادوں پر قائم کیا، تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱۹۷۳ء میں وہ ہارورڈ سے کناڈا کی ڈلہوزی یونیورسٹی میں ریلیجن کے پروفیسر ہو کر چلے گئے، وہاں سے پانچ چھ برس کے بعد دوبارہ ہارورڈ واپس آ گئے، اور تاوم تحریر وہیں ہیں۔

اسمتھ اپنے فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مذہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، تقوی ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں ہے، یہ دراصل انسان اور خدا کے باہمی تعلق کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی، اسمتھ کے نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں اور دوسری کو اجتماعی روایات، انفرادی کیفیت کو اسمتھ اپنی زبان میں FAITH اور ہماری زبان میں "ایمان" کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہو سکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے اس لیے ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہو سکے، اور ہر شخص کے ایمان کا پلہ بھی برابر نہیں ہو سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسمتھ "ایمان ہر کس بقدر ہمت اوست" کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کمیت اور کیفیت کے فرق کے باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیرووں کی اجتماعی روایات کا نام اسمتھ CUMULATIVE TRADITION دیتے ہیں، ظاہر میں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں زمان و مکان کے [illegible] فرق کی وجہ سے تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور چونکہ روایات زمان و مکان کے

فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس لیے اگر اس جہت سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار مانا جائے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں FAITH کو ہمیشہ واحد کے صیغے میں لکھتے ہیں، اپنی پرانی تحریروں میں انھوں نے جہاں کہیں اسے ضرورۃً جمع کے صیغے میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت کے وقت "FORMS OF FAITH" (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا ہے۔

ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گے، اسی اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ "اسلام" کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے، اس نتیجہ پر پہونچ جانے کے بعد وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے اختلاف کرتے ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ سمجھ کر اس سے اپنا مذہب اسلام مراد لیتے ہیں، اور اسمتھ اسے "اطاعت خداوندی" کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اسم فاعل "مسلم" کی تشریح بھی وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے تو مسلم کا مطلب ہے "فرمانبردار بندہ" لیکن اب اصطلاحاً مسلم ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے دو الگ الگ ہم معنی لفظ "مسلم" اور "مسلمان" استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنوں میں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنوں میں

تو پھر اسمتھ یا کسی جمیک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "میں مسلمان نہیں ہوں" لیکن اسی بات کو وہ عربی زبان میں "مسلم" کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں "لست بمسلم" کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرمانبردار بندے نہیں ہیں، اور یہ بات ان کے عقیدے اور عمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کو وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں، اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندۂ مسلم کی زندگی ہے، اپنے کو بندۂ مسلم سمجھنے لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں نہیں پیدا ہوئے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جا سکتا، انھوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے، وہی سپردگی ان کے نزدیک "الاسلام" ہے، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین یا "ریلیجن خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں۔" پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علماء کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورۂ بالا تعریف کے پیش نظر صبح و شام اپنی زبان میں "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" کا ورد کر رہے ہیں، اس کے باوجود انھیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے، لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اُس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علماء اور پادری اور خود اسمتھ جس "اسلام" کو اپنا دین کہتے ہیں، وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے، جو صدہا برس کے تاریخی اور سماجی عوامل کے نتیجے میں ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے۔

اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہمعصر مسلمانوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ایک مکمل، جامع اور متعین نظام ہے، ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لیے اجنبی تھا، مثلاً قرآنی آیات "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" اور "رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتلاتے ہیں: الاستسلام لامری والانقیاد لطاعتی علیٰ ما شرعت لکم من حدودہ و فرائضہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض من وعن وہی ہیں جنھیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اسی لیے مسلمان ہونے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کر لے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے وہ اطاعتِ الٰہی کو شریعتِ اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے شریعت اسلامیہ، اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی روایات کہتے ہیں، جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے، یہاں پر اسمتھ تقریباً وہی بات کہتے ہیں جو مولانا ابو الکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ذیل میں یا پاکستان کے عالم مولانا جعفر شاہ پھلواری ندوی نے اپنی کتاب "الدین یسر" میں دین اور شریعت کی بحث میں کہی ہے، کہ "دین ایک ہے، ایک رہا ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا، ہاں شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔" اسی کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اگر اپنی اپنی اصل شریعتوں پر صدق دلی اور ایمانداری کے ساتھ عمل کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ان کی شریعتوں کی دعوت بھی بعینہٖ وہی ہے جس کی طرف اسلام لوگوں کو بلا رہا ہے، اگر بات اسی اجمال میں چھوڑ دی جائے تو

شاید اسمتھ کو بھی مولانا آزاد کے اس نکالے ہوئے نتیجہ سے اختلاف نہ ہوگا، ہاں ان میں اختلاف اس وقت ہوگا جب شریعت اسلامیہ کو ایمان کا مرادف قرار دیا جائے اور اس کے بغیر تکمیل ایمان کو ناممکن کہا جائے،

(اسمتھ کو "شماریات" سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (٪۸۵٫۱) اور ۱۵ (٪۱۴٫۰۹) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سنہ ۱۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہو جاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں سات (٪۷٫۰۱) اور ۹۳ (٪۹۲٫۰۹) کی نسبت رہ جاتی ہے) ان اعداد و شمار کی روشنی میں اسمتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کو جو ایک جامع نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ نزول قرآن کا بنیادی مقصد ایک مسلم کمیونٹی کا قیام تھا، وہ عہد جدید کی پیداوار ہے، اسمتھ کے خیال میں اگر قرآن کا یہی مقصد رہا ہوتا تو پھر وہ ان یہودیوں اور عیسائیوں پر تنقید نہ کرتا جو جنت کو اپنے مذہبی دائرہ میں محدود سمجھتے تھے۔

اسمتھ ایک طرف خدا پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے کو "مسلم" بھی کہتے ہیں، مگر دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرتے کہ "مسلم" ایک اسم معرفہ ہے، اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے محمد صلعم کے ذریعہ ایمان کی دولت پائی ہے، اسی لیے وہ مسلمانوں

اور ان کے مذہب کو صرف "مسلم" اور "اسلام" کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مختلف زمانوں میں جو نام رائج رہے ہیں ان کے بارے میں اسمتھ کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی بدنیتی یا توہین کے باعث نہیں تھے، یورپ جن جن طریقوں سے اسلام سے واقف ہوا اسی قسم کے نام وہ اسے دیتا گیا، کسی زمانہ میں اسے "گروہ سارا سین" کہا گیا، پھر جب رینا ساں اور ریفارمیشن کے دور میں ریلیجن (مذہب) کی اصطلاح یورپ میں رائج ہوئی تو اسلام کو "مذہب سارا سین" بتایا گیا، پھر اسے "تاتاریوں اور ترکوں کا مذہب" نام دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ سترہویں صدی میں پہلی بار جب یورپ نے لفظ اسلام کا استعمال کیا تو اس وقت بھی اسے مذہب کیلیے نہیں بلکہ اہل مذہب کے واسطے بولا گیا، اور اسلام کی تعریف "کیتھولک یا صحیح العقیدہ (RIGHT-BELIEVING) مسلمان" کے الفاظ سے کی گئی، انیسویں صدی تک یورپ کی تحریروں میں ہمیں اس قسم کے جملے مل جاتے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "اپنے عقیدہ کے اعتبار سے تم ایک اسلام ہو" جب تک اسلام بمعنی مسلم مستعمل رہا اس وقت تک مذہب اسلام کے لیے "اسلام ازم" کا لفظ رائج رہا، انیسویں صدی سے محمڈن اور محمڈن ازم کے الفاظ مختلف ہجے کے ساتھ رائج ہوئے اس صدی کے نصف اول سے بالعموم اسلام اور مسلم بولا جانے لگا۔

خود اسمتھ نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہی دو الفاظ استعمال کیے ہیں، بلکہ ان الفاظ کو رواج عام دینے کے لیے وہ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے قلمی اور زبانی جہاد بھی کر رہے ہیں، اس معاملہ میں وہ اس حد تک زود حس ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں جب ان کے استاد سر ہملٹن گب کی مشہور زمانہ کتاب "محمڈن ازم" شائع ہوئی تو اسمتھ نے کتاب کے نام کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں خود ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے

اور گب کی کتاب کے عنوان کو بالکل ہی بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، اسمتھ نے کھل کر تو یہ بات نہیں کہی ہے کہ وہ اب اسلام کے بجائے محمڈن ازم کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اسلام کے بجائے محمڈن ازم پر اصرار کرے تو اسمتھ کا ردعمل اتنا سخت نہ ہوگا جتنا گبؔ کی محمڈن ازم شایع ہونے کے وقت تھا، اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اسمتھ کے ایک اور خیال کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اسمتھ کے خیال میں کسی بھی مذہب کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کے احساسات اور جذبات، ان کے افکار و اعمال، نیز مذہب کے تاریخی تسلسل اور "شعار" (SYMBOL) کو نظر انداز کر کے صرف ان کی کتابی الٰہیات کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا، اسلام میں رسول اللہ صلعم کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسے ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے، اپنی کتاب "THE FAITH OF OTHER MEN" میں انھوں نے دنیا کے چند بڑے مذہبی طریقوں کا تعارف کراتے ہوئے مذہبی شعار یا 'RELIGIOUS SYMBOL' کی بحث اٹھائی ہے اور بتایا ہے کہ ہر مذہب کا ایک نہ ایک شعار ہوتا ہے، کسی مذہب میں یہ شعار صوری ہوتا ہے، جیسے عیسائیوں کی صلیب، اور کہیں معنوی ہوتا ہے جیسے اسلام کا کلمۂ شہادت، کلمۂ شہادت سے ایک مسلمان اگر ایک طرف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، کلمۂ شہادت کی تشریح کرتے ہوئے اسمتھ یہ بتاتے ہیں کہ کلمہ کے دوسرے جزو محمد رسول اللہ کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے رتبہ کا تعین مقصود نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد آپ کے منصب کا اظہار ہے، اس منصب کی رو سے رسول اللہ حقیقتاً انسانوں تک "وحی الٰہی" کی ترسیل کا ایک ذریعہ تھے، اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مسلمانوں کے ان باہمی مناظروں کو یاد کریں جو "ذات نبوی" کے تعین کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ

اسمتھ ایک طرح سے ان مسلمان علماء کے ہمنوا ہیں جنھیں خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کے درمیان واضح خط کھینچنے کے الزام میں مختلف خطابات سے نوازا جاتا رہا ہے، لیکن مسلمانوں کو اپنے رسول سے جو جذباتی محبت ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیا جائے "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اللہ کے ساتھ تو بے تکلفی برتنے کی جرأت کر لیتا ہے لیکن رسولؐ کے معاملہ میں اسے محتاط رہنا پڑتا ہے، ایک مسلمان توحید خالص پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے کسی رسول یا نبی کو اللہ کی الوہیت میں شریک تو نہیں مانتا، لیکن اس کے باوجود وہ عشق رسول کا مظاہرہ ان الفاظ میں بھی کرتا ہے ؎

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفٰے ہو کر

اس موقع پر ہمیں "نور محمدی" اور "امتناع نظیر" کی بحثوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جس نے اس عقیدہ کو جنم دیا کہ "الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقت محمدیہ ہو گئی" اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمان آنحضرتؐ کو صرف خدا کا قاصد نہیں بلکہ شارع بھی مانتے ہیں، آپ کے فرمودات کا درجہ اگرچہ قرآن کے بعد آتا ہے، لیکن اسے "ناسخ قرآن" کہنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، مسلمانوں کی یہ کلامی بحثیں بھلے ہی عمومی نہ ہوں لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اسلام کی تکمیل (خواہ اسے لغوی معنوں میں بولیں، یا اصطلاحی معنوں میں) ذات اقدس کے بغیر ممکن نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحیح اسلام (یا اسمتھ کے لفظوں میں صحیح طریق سپردگی) مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ ہے جس کا نمونہ رسول اکرمؐ نے اپنے قول و عمل سے پیش کیا، اس پس منظر میں جب ہم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسمتھ اپنے اس خیال میں بہت حد تک حق بجانب نظر آتے ہیں کہ اسلام کو اگر کوئی شخص محمڈن ازم (یا محمدیت) کے عنوان سے پیش ہی کرتا ہے تو اس کے پاس اس کے لیے کچھ نہ کچھ بنیادیں ہوتی ہیں۔

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتا ہے، یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظر سے

نہیں گذرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بد دیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں، اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دلوں میں گھس کر انھیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے، اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیل مذہب کا نہیں ہے اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسموپولیٹن ہوتا جا رہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی یا ایک "لا ادریا" (AGNOSTIC) خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار، بدھسٹ ہو یا ہندو، یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہیے۔

یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوے میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خلوص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے، اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو، لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انھی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں، آخر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، جی نہیں شکریہ! لکم دینکم ولی دین۔

ہندوستان میں فقہ اسلامی کے نظام اور علوم فقہیہ کے رواج میں ٹونک کا حصہ

از حکیم محمد عمران خان صاحب عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک

علم فقہ ایسا جامع علم ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، کتاب و سنت دین اسلام کے دلائل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ہدایات دیتے ہیں، ان ہی دلائل کو سمجھنے اور زندگی کے تمام شعبوں پر منطبق کرنے کا نام علم فقہ ہے، مسائل عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات اور لین دین سے، نکاح و طلاق، رہن سہن یا دوسرے معاشرتی و سماجی مسائل ہوں، یا دیگر اقوام و ممالک کے تعلقات سے متعلق امور، معاملات ملکی ہوں یا قومی، غرض یہ ایسا جامع علم ہے، جس کی ضرورت قدم قدم پر موجود ہے، اور ہر معاملہ میں رہنمائی اس علم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اور ہر موقع پر فہم و فراست کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے صاحب کشاف الاصطلاح نے اس علم کو "علم الدرایہ" کہا ہے اور اس علم کی تعریف اس طرح کی ہے،

"ہو معرفۃ النفس مالہا وما علیہا، ہکذا نقل عن ابی حنیفہ رحمہ اللہ"

سبحان اللہ کیا جامع تعریف ہے، ایسا علم جس کے ذریعہ انسان کو ان تمام باتوں کا علم ہو جائے، جو اس کے لیے مفید ہو سکتی ہیں یا اس کو نقصان پہنچا سکتی ہیں یا اس کے خلاف ہو سکتی ہیں،

اس علم کا نام علم فقہ ہے، اس وجہ سے امام غزالیؒ نے اس علم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگوں نے علم فقہ کو بہت محدود کر دیا ہے، اور علم فتاوی اور اس کے دلائل وعلل کے سمجھنے کو علم فقہ کا نام دیدیا ہے حالانکہ عصر اول میں یہ علم اپنی معنویت کے لحاظ سے بڑی جامعیت رکھتا تھا، اس کا اطلاق علم آخرت پر اس حیثیت سے ہوا کرتا تھا کہ اس علم کے ذریعہ آفات نفس کی تمام باریکیوں کا علم ہوتا ہے، اس علم کے ذریعہ دنیا کی حقیقت اور آخرت کی معرفت حاصل ہوتی ہے، غرض علم فقہ ایسا جامع علم ہے کہ حیات انسانی کا کوئی پہلو اس علم سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے، عملی زندگی سے متعلق جس قدر احکام ہیں، ان کے جس قدر تفصیلی دلائل ہیں وہ اس علم سے حاصل ہوتے ہیں، گھریلو زندگی سے لیکر ملکی مسائل تک اور شہری زندگی سے لیکر بین الاقوامی معاملات انٹرنیشنل مسائل تک جو ہدایات ہمیں حاصل ہوتی ہیں وہ اسی علم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، اس وجہ سے ابتداء سے اس علم کی بڑی اہمیت رہی۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کتاب اللہ کی ترتیب وحفاظت اور سنت رسول اللہؐ واحادیث کی تدوین وحفاظت کا کام بڑی تیزی اور مستعدی سے ہوا ہے، اس وجہ سے اس علم کی ضرورت اس وقت سے بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ قرآن مجید ہو یا احادیث کے ذخیرے، قرآن مجید اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے اور احادیث اپنی وسعت اور کثرت روایت کی وجہ سے، دونوں اس بات کے متقاضی تھے کہ تحقیق وتنقیح اور حسب ضرورت استنباط واجتہاد کے ذریعہ اصول کا استخراج کیا جائے اور بمصداق آیت "فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون" (سورۂ توبہ) امت مسلمہ کے ذمہ داروں نے جنھیں اللہ نے یہ صلاحیت دی تھی، اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے کچھ اصول مرتب کئے جو اصول فقہ کہلائے اور اس کے مطابق مسائل کی

تدوین وترتیب شروع ہوئی، اور اجماع وقیاس کے اصول مرتب ہوئے، جن مسائل میں صراحت نہیں ملی، وہاں ان اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت پیش آئی، آج پوری امت مسلمہ پر بلکہ پوری انسانیت پر ان لوگوں کا بڑا احسان ہے جنھوں نے اللہ کی دی ہوئی اُن صلاحیتوں کے ذریعہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے بڑی بڑی زحمتیں برداشت کیں، اور حتی المقدور جد وجہد وتحقیق وتنقید کے بعد، علوم کے وہ ذخیرے تیار کئے جو ہمارے لئے مشعل راہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ہندوستان میں علم فقہ اور اس کے متعلقات پر زیادہ تصنیفات فراہم ہونے کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ جب اسلام براہ راست ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہنچا، پھر صوفیہ وبزرگان دین کے ذریعہ ہندستان کے مختلف علاقوں میں پھیلا، پھر مختلف حملوں کے بعد جب یہاں کا اقتدار بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگیا، اور وہ بھی تھوڑی مدت کے لیے نہیں بلکہ تقریباً آٹھ سو سال تک مسلسل انھیں اقتدار حاصل رہا، اور یہ پوری مدت اس طرح گذری کہ ملکی پیمانے پر بھی اور عملی زندگی کے مطابق بھی ہر روز نئے مسائل کا سامنا تھا، اور ہر مرحلہ پر دین کی رہنمائی کی ضرورت تھی، ـــــــ ایسی ہی ضرورتوں کی بناء پر ہر دور میں عملی زندگی کے لیے ہر روز پیش آنے والی ضرورت کے مطابق، عوام وخواص کو ہدایت ملتی رہے، مسائل میں کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہو ـــــــ یہی داعیہ ہر دور میں اہل ہند کے لئے جدید تصنیفات کا باعث بنا، لہذا جس طرح ابتدائی صدیوں میں تفاسیر ومسانید کے مجموعے ملتے ہیں اسی طرح اسکے بعد کی صدیوں میں فقہی مجموعے اور مسائل کے ذخیرے کثرت سے جمع ہوتے رہے۔

ابتدائی دور میں جب کوئی مہم کسی ملک کے لیے روانہ کی جاتی تھی، تو اس وقت اول تو اس مہم کا ذمہ دار کوئی صحابی تابعی، تبع تابعی یا عالم دین ہوا کرتا تھا لیکن اس کے بعد کے ادوار میں بھی

ہر مہم کے ساتھ افتاء و قضاء یا احتساب و نگرانی کے لئے کوئی ذمہ دار ضرور بھیجا جایا کرتا تھا ـــــ
ہندوستان کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ پر جس قدر مہمات ہوتی رہیں، ان میں فوج کے ساتھ قاضی یا مفتی کی حیثیت سے کسی ذمہ دار کو ضرور بھیجا جاتا تھا، چنانچہ حضرت ربیع بن زیاد حارثیؓ نے جب ۳۰ھ میں سجستان اور سندھ کے علاقے میں فوج کو فتح کیا ہے اور ڈھائی سال تک ان کا قیام یہاں رہا، اس وقت حضرت حسن بصریؒ (تابعی) مفتی اور میر منشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ برابر رہے، اس درمیان میں اگر حضرت حسن بصریؒ کسی دوسری مہم پر جاتے تو ان کی غیر موجودگی میں حضرت جابر بن یزیدؒ افتاء کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، طبقات ابن سعد میں اس سلسلہ میں ہے،

کان الحسن یغزو وکان مفتی	جب حسن بصریؒ جہاد میں چلے جاتے تھے،
الناس ههنا جابر بن یزید	سجستان میں جابر بن یزید لوگوں کے مفتی
قال ثم جاء الحسن	تھے، اور جب حسن بصری آجاتے تھے تو وہ
فکان[1]	فتوی دیتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں سندھ میں محکمۂ قضا کا مستقل انتظام ہوگیا تھا، اس لئے ان کی جانب سے سندھ میں مستقل قاضی مقرر کئے جاتے رہے ـــــ خلیفہ ابن خیاط نے اپنی تاریخ میں مختلف علاقوں کے قضات کی تفصیل بیان کی ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کے دور میں سندھ کا مستقل قاضی حضرت حکیم بن جبلہ عبدی کو لکھا ہے[2]

حضرت عثمانؓ کے عہد میں یکے بعد دیگرے سندھ کے تین امیر مقرر ہوئے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن معمر قریشی تیمی جو فاتح مکران بھی ہیں اور فارس کے امیر بھی رہے ہیں،

(۲) حضرت عمیر بن عثمان بن سعد،

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۸۰ [2] تاریخ خلیفہ ابن خیاط ج ۱ ص ۱۹۰

(۳) ابن کنندیہ قشیری۔

ان امرائے ثلثہ کے ادوار میں حضرت حکیم بن جبلہ عبدی ہی سندھ و مکران کے مستقل قاضی و مفتی رہے ہیں ـــــ یہ وہی حکیم بن جبلہ عبدی ہیں جنھیں حضرت عثمانؓ نے ثغر ہند کے حالات معلوم کرنے کے لئے ابتداء ہی میں سندھ بھیجا تھا۔

۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے موسیٰ بن یعقوب ثقفی کو ارور (سندھ) کا قاضی بنایا اور زمانہ دراز تک ان کی اولاد بھی وہاں قضا اور خطابت کی خدمت انجام دیتی رہی،[1]

منصورہ کے قاضی ابوالعباس احمد بن محمد بن صالح منصوری سندھی تھے، حاکم نے اپنی معجم میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ اگرچہ داؤد ظاہری کے متبع تھے لیکن اپنے مذہب کے بڑے امام گذرے ہیں، درس و تدریس کا سلسلہ بھی بہت کافی تھا، اور متعدد تصانیف کے بھی مالک ہیں، ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں ان کی تصنیفات کی تفصیل بتائی ہے،[2]

۲۸۳ھ میں خلیفۂ بغداد کی جانب سے محمد بن ابی الشوارب کو سندھ کا قاضی بنا کر بھیجا گیا، چند ماہ بعد سندھ میں ان کا انتقال ہوگیا، اور ان کے بعد ان کی اولاد زمانہ دراز تک یہ خدمت انجام دیتی رہی[3]

غزنوی سلاطین کے عہد میں الشیخ ابوالمنصور بن علی غزنوی ممتاز اہل علم میں سے تھے۔ لاہور میں دیوان الانشاء کے افسر اعلیٰ تھے، ابوالریحان البیرونی صاحب کتاب الہند اسی دور کے ماہرین فنون میں سے ہیں، سندھ کے رہنے والے تھے، ہندوستان کے موضوع پر کتاب الہند ان کی مشہور کتاب ہے، الشیخ بوعلی سینا کے ہم عصر بھی تھے، اور ان میں باہمی مراسم بھی تھے، خود محمود غزنوی علوم میں بڑا ماہر اور علم فقہ میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا، اور صاحب تصنیف بھی تھا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۲۵ [3] ابن الفرج، ص ۲۴۳

اس کی کتاب کتاب التفرید جو فقہ حنفی میں ہے، ممالک غزنی میں عام شہرت رکھتی ہے۔

اسی طرح علی بن عثمان الہجویری المتوفی ۴۶۵ھ جو کشف المحجوب کے مصنف ہیں، احمد بن محمد التیمی قاضی منصور، عمر بن سعید لاہوری الفقیہ المتوفی ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء محمد بن عثمان جوزجانی المتوفی بعد از ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء جو فقہ اور اصول فقہ اور علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ان ادوار کے مشہور فقیہ و محدث اور باکمال گذرے ہیں۔

سلطان شہاب الدین غوری کا دور ہندوستان میں بڑا اہم دور ہے، اس لیے کہ اس کے دور میں یہاں مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی، اس دور کے فضلاء میں سید کمال الدین عثمانی ترمذی، سراج الدین محمد بن عثمان جوزجانی، حضرت خواجہ اجمیری، اور دوسرے ممتاز مشائخ اسی دور میں ہندوستان تشریف لائے اور ان کی وجہ سے اس ملک کو بڑا فیض پہنچا۔

التمش کے دور میں شیخ الاسلام کا منصب مولانا جلال الدین، مولانا نجم الدین صغری اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے سپرد رہا، اس دور کے قضاۃ میں قاضی سعد الدین کردری، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی کبیر الدین، قاضی قطب الدین کاشانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد بلبن کا دور بھی علم و فضل کا دور تھا، اور نامور فقہاء اور اہل علم اس دور میں خدمات انجام دیتے رہے، جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا۔

مملوک سلاطین کے دور میں بھی قانون شریعت ہی بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا، غیر مسلموں کے لیے ہندو کوڈ کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور انھیں آزادی حاصل تھی۔ صدر جہاں اسی دور میں بہت اونچا منصب تھا، اس کے علاوہ قاضی القضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام کے عہدے مقرر تھے، جن کے مطابق عدالتی نظام چلایا جاتا تھا، ذیلی عہدیدار علیحدہ ہوا کرتے تھے،

دیوانی مقدمات قاضی کے سپرد ہوا کرتے تھے، فوجداری مقدمات کے لیے ایک امیر داد مقرر رہتا تھا، اسی طرح حسب معمول کوتوال و محتسب مقرر رہا کرتے تھے، زکوٰۃ و عشر کا نظام ہر دور میں بہت پختہ رہا کرتا تھا۔

بہر حال بعد کے ادوار میں مولانا برہان الدین النسفی، قاضی جلال الدین کاشانی المتوفی ۶۴۸ھ جنھیں معز الدین بہرام شاہ نے دہلی میں قاضی الممالک کے عہدے پر سرفراز کیا تھا، اور وہ اودھ کے بھی قاضی رہے ہیں، الشیخ حسین بن محمد الصغانی لاہوری صاحب مشارق الانوار المتوفی ۶۵۰ھ، حسن بن علی البخاری المتوفی ۶۹۵ھ، قاضی رکن الدین صاحب سامانوی، مولانا سدید الدین الدہلوی وغیرہ یہاں ممتاز رہے ہیں۔

سلاطین مغلیہ کے ادوار میں تو ہندوستان میں اہل علم و اہل فن و کمال کی اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ ہر صوبہ اور ہر علاقہ میں ہنرمندان باکمال کا گویا ایک جال بچھا ہوا تھا، اور تصنیف و تالیف کی بھی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی موضوع اور کوئی فن ایسا نہیں ملتا جس میں اہل ہنر نے اپنے کمالات نہ دکھائے ہوں۔

بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ دوسرے علوم کے مقابلہ میں علم فقہ اور اصول فقہ پر اہل ہند کی تصنیفات زائد ہیں، اگر عمومی اندازہ لگایا جائے تو صرف فقہ و اصول فقہ میں ہندوستانی مصنفین کی کتابیں تقریباً ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک ہونگی، فقہ کی مشہور کتابیں ہدایہ، شرح وقایہ، کنز الدقائق وغیرہ جو شب و روز داخل درس رہا کرتی ہیں ان کے شروح، حواشی اور تراجم ہندوستانی مصنفین کے اس قدر ہیں کہ جن کا شمار شاید مشکل ہے، صرف ہدایہ کی شروح و حواشی غالباً تین درجن سے کم نہیں ہیں، یہی حال شرح وقایہ وغیرہ کا ہے، اصول فقہ پر بھی اسی وجہ سے ہندوستان میں کافی کتابیں تصنیف ہوئیں، منار الانوار،

مسلم الثبوت، حسامی اور توضیح و تلویح، ان کتابوں کے شروح و حواشی اگر صرف ہندوستانی مصنفین کے جمع کئے جائیں تو خود ایک مستقل تصنیف بن جائے۔

فن فقہ کا ایک اہم عنوان علم الفتاوی ہے۔ اس عنوان پر بھی اہل ہند کی کافی اہم تصانیف ملتی ہیں، فتاوی فیروزشاہی اور فتاوی تاتارخانیہ فیروزشاہ تغلق کے دور کی یادگاریں ہیں، فوائد فیروزشاہی کے مرتب ملا محمد اتاری ہیں اور فتاوی تاتارخانیہ کے مرتب شیخ عالم ابن علاء دہلوی ہیں، جو انھوں نے فیروز تغلق کے وزیر تاتارخاں کے لئے ترتیب دیا تھا، اس طرح مجموعہ خانی الغ قتلق بہرام خاں کے لیے اور فتاوی ابراہیم شاہی سلطان ابراہیم شاہ کے لیے تصنیف ہوئیں، اس طرح فتاوی حمادیہ از ابو الفتح مفتی رکن الدین ناگوری، فتاوی برہنہ از شیخ نصیر الدین لاہوری، خزانۃ الروایات از قاضی جگن حنفی گجراتی، فتاوی نقشبندیہ از معین بن محمود کشمیری، فتاوی تورانیہ از میرک محمد سندھی، فتاوی محمود شاہی، اور اس جیسے بیسیوں فقہی مجموعے اور فتاوی کے ذخیرے ہیں جو ہندوستانی علماء نے ہر دور میں ترتیب دئے اور اہل علم کے درمیان متداول رہے اور اب بھی ہیں۔

سب سے بڑھکر فتاوی عالمگیری کی ترتیب اہل ہند کا وہ بڑا کارنامہ ہے، جو سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی ادنی توجہ سے مرتب ہو گیا۔ اسے اگر فقہی مسائل کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو زیادہ نہیں ہوگا، اسکی جدید ترتیب کی ضرورت ہے، اسی طرح فتاوی شامی، فتاوی عالمگیری اور فقہ کی دوسری اہم تصنیفات کے وہ اردو تراجم جو اہل ہند نے یہاں کی ضرورت کے پیش نظر تیار کئے، آج یہ چیزیں ان حضرات کے بڑے کارنامے نظر آتے ہیں۔

یہی حال اصول فقہ اور فقہ کے دوسرے شعبوں فرائض، فقہ حدیث، استنباط و اجتہاد وغیرہ دوسرے ذیلی موضوعات کا ہے، جن میں اہل ہند کی کافی تصانیف مرتب ہوئی ہیں،

ہندوستان میں، چونکہ اکثریت حنفی مسلک کی رہی ہے، اس لئے مذکورہ بالا اکثر تصانیف اس مسلک سے متعلق ہیں، لیکن مدراس، مالابار یا کوکن ایسے علاقے ہیں جہاں فقہ شافعی بھی رائج ہے، اس لئے ہندوستان میں فقہ شافعی پر بھی کافی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، پھر سنی فقہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں شیعی فقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے، اس لئے سنی فقہ کے ساتھ شیعی مسلک پر بھی یہاں کافی تصنیفات ہیں، پھر ان سب چیزوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر جو رسائل ہر دور میں ترتیب دئے جاتے رہے ان کی تعداد تو شمار سے باہر ہے۔

مختلف علوم و فنون پر ہندوستان کے ہر علاقے میں جس قدر ذخائر خود اہل ہند کے تصنیف کردہ پھیلے پڑے ہیں ان کے متعلق تحقیق و تنقید اور ریسرچ کے شعبوں اور اس کی تحقیقات کے اس قدر عام ہو جانے کے باوجود بھی یہ موضوع ہمیشہ تشنہ رہتا ہے،

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرکزیت بالکل فوت ہو چکی تھی، اور پورے ملک کے حالات ابتر اور زبوں تھے، اس انتشار اور ابتری کے نتیجہ میں ملک میں متعدد مسلم و غیر مسلم ریاستیں وجود میں آئیں، ان میں ریاست حیدرآباد کا نام سرفہرست آتا ہے، جو اپنی وسعت، اپنی قدامت، اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے نظام حکومت کے معاملہ میں سب سے ممتاز اور نمایاں رہی ہے، اسی طرح بنگال، مدراس (ارکاٹ)، اودھ، روہیلکھنڈ، بھاولپور، بھوپال، رامپور اور جاورہ وغیرہ ایسے مراکز تھے، جو مسلم تہذیب و تمدن کا مرکز بنے رہے، اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اپنا ایک نظام حکومت چلاتا رہا، مگر اسی کے ساتھ بدیشی حکومت، انتشار کے اس دور میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات قائم کر رہی تھی، یہاں تک کہ اس کی حکومت یہاں قائم ہو گئی۔

اس انتشاری دور میں راجپوتانہ میں، راجپوتوں کی حکومتیں اپنا بڑا اثر رکھتی تھیں،

سلاطینِ مغلیہ کے دور میں بھی ان کے اثرات کم نہیں تھے، لیکن مغلیہ دور ختم ہوجانے کے بعد یہ ریاستیں بڑی طاقت ور اور با اثر نظر آتی تھیں، جو کسی طرح دوسری ریاستوں کے سامنے جھکنے اور زیردست ہونے کو تیار نہیں تھیں ——— انیسویں صدی شروع ہو رہی تھی کہ روہیلکھنڈ کے علاقہ سے میر خان کے نام سے ایک طاقت ابھری اور چند برسوں میں راجپوتانہ کا پورا علاقہ اس طاقت سے متاثر ہوتا نظر آنے لگا، دور دور سے اس کی شہرت ہوئی، مرہٹہ طاقتوں نے اس میں مزید اضافہ کر دیا، اس وجہ سے دس پندرہ سال کی مدت میں یہ حالات دیکھ کر برطانوی گروپ کو بڑی فکر لاحق ہوئی، اس لئے فوری طور پر اس نے اس طاقت سے مصالحت کر کے اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے روکا، اور ۱۸۱۷ء میں راجپوت ریاستوں کے بالکل وسط میں ریاست ٹونک کے نام سے ایک مسلم ریاست کا وجود عمل میں آگیا۔

نواب خان جو اس ریاست کے بانی اور پہلے فرمانروا تھے، ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے، ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں جنگی مہمات پر روانہ ہوئے، ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء سے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء تک یہ مہمات جاری رہیں، ۱۸۱۷ء میں یہ ریاست قائم ہوگئی، اور سترہ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ میں ٹونک میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس نومولود اور نوخیز ریاست نے اس قلیل مدت میں اپنے وجود، اپنے قیام، اپنے نفاذ، بلکہ اپنے نظم و نسق ریاست و نظام عدالت کا ایک اچھا نمونہ قائم کرنے میں کیا ترقی کی، تاریخ داں حضرات ہی اس کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ملکوں اور ریاستوں کے لیے دس بیس سال کی مدت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر نواب کے اس سترہ سالہ دورِ حکومت میں نہ معلوم کیا صلاحیتیں پوشیدہ تھیں کہ دس بیس سال کی اس مدت میں یہ ریاست ایک نمونہ کی ریاست بن گئی، اس مختصر سی مدت میں علم و فضل، تصنیف و تالیف و فن و کمال کا بڑا مرکز بن گئی، نظم ریاست درست ہونے کے ساتھ ساتھ نظام عدالت میں بھی بڑی ترقیاں ہوئیں،

اس ترقی کے بھی کچھ اسباب و عوامل تھے، اس موقع پر ان اسباب پر بھی غور کرنا ضروری ہے، نواب میر خان اور ان کے ساتھی جنگ جوئی، جفاکشی اور فوجی مزاج کے حامل تھے، ایسے حالات میں علمی ترقیوں کا حصول بظاہر آسان نظر نہیں آتا، اس لیے کہ دونوں میں ایک طرح کا تضاد ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا ——— اس موضوع پر کافی غور و خوض اور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نواب میر خان اور ان کے ساتھی اگرچہ فوجی ذہن رکھتے تھے لیکن ان میں اور ان کے ساتھیوں میں دین پسندی بھی ابتداء سے تھی، یہی وجہ ہے کہ راجپوتانہ کی جنگی مہمات میں مصروف ہونے سے قبل شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور دہلی وغیرہ کے دوسرے بزرگوں سے انھیں اس وقت سے عقیدت تھی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشورے کے مطابق سید احمد شہید رحمہ اللہ کا نواب میر خان کے لشکر سے سات سال تک تعلق رکھنا اور ان کے علاوہ بھی مولوی محمد حسن، مولوی نظام الدین اور مولانا خلیل الرحمٰن وغیرہ دوسرے اہل علم حضرات کا لشکری زندگی میں پورے لشکر کے ساتھ رہنا بڑی خوش آیند بات تھی، پھر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ مولانا بحر العلوم لکھنوی کے بیٹے مولوی محمد نافع، جنگ و جدل ہی کے دور میں نواب کے ساتھ لشکر میں رہے،

اس سب سے بڑھ کر بات یہ ہوئی کہ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۹ء میں نواب میر خان کی شادی بھی ایک علمی گھرانے میں ہوگئی، یعنی اخوند محمد یاز خان کی بیٹی سے نواب کا رشتہ ہوا، اور صرف ایک رشتہ کی وجہ سے نہ معلوم کتنے علمی رشتے تازہ اور پختہ ہوگئے، راجپوتانہ اور دوسری ریاستوں میں نواب اپنی فوج کے ساتھ جہاں جاتے اپنے کو دینی ماحول سے قریب پاتے، یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کے بزرگانِ دین اور باکمال لوگوں سے فطرۃً ان کا تعلق بڑھتا چلا گیا، چنانچہ ناگور، اجمیر، دہلی اور گوالیار وغیرہ کے واقعات میں ایسے تعلقات کا برابر ذکر ملتا ہے۔

نواب کی شادی اور نواب وزیرالدولہ کی پیدائش کے بعد سے مولوی حکیم انور علی صاحب ساکن رامپور کا تعلق بھی نواب کے لشکر سے ہو گیا، اور فاتحہ خوانی کے بعد وہ نواب وزیرالدولہ کے اتالیق مقرر ہوئے، نواب صاحب کی طرح متعدد جرنیل فوج اور رسالہ دار بھی علم دوست اور علماء نواز تھے، چنانچہ مختارالدولہ محمد شاہ خان، مختارالدولہ محمود خان، میاں اکبر محمد خان، جناب فقیر محمد خان گویا جیسے قابل اور علم دوست افراد ان کے مشیر اور وزیر تھے، جن کی معیت نواب کے لیے سونے پر سہاگا ثابت ہوئی اور جن کے نیک مشوروں سے انھیں بڑا فائدہ پہنچا، اس دینی ماحول سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ریاست ٹونک کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہی نواب اور ان کے امراء کے ساتھ جس قدر علمی خانوادے فوراً ٹونک منتقل ہونا شروع ہو گئے، اور دو چار سال کی مدت میں یہ علاقہ رشک چمن بنتا نظر آنے لگا، نواب کے خسر اخوند ایاز خان کے بڑے ساتھی ملا عرفان رامپوری تھے، ان کے لڑکے مولوی محمد مفتی اور مولانا خلیل الرحمٰن کی مسند ہائے درس محلہ راج دارہ اور گوئیا تالاب رامپور میں قائم تھی،[1] انھیں ٹونک بلایا گیا، مولانا محمد صاحب مفتی کو افتاء و قضاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی، اور مولانا خلیل الرحمٰن نے مسند درس جمائی، ان کے بھائی مولوی سعداللہ صاحب جامع مسجد کے خطیب و امام مقرر ہوئے، شہر میں درس و تدریس کے کئی مرکز کھولے گئے، اور قابل افراد کو ان کا ذمہ دار بنایا گیا،

نواب کی فوج کے ساتھ پورا دیوان خانہ بھی رہا کرتا تھا، اور اس کے ذمہ دار بھی بڑے قابل اور تجربہ کار حضرات بھی ہوا کرتے تھے، رائے داتا رام، رائے ہمت رام، منشی بساون لال شاداں مرتب امیر نامہ جیسے قابل اور میر منشی ان کے دفتر کو چلایا کرتے تھے، اس لئے ریاست کا وجود عمل میں آنے کے بعد بھی یہ تمام حضرات یہاں کے کلیدی عہدوں پر فائز کر دیے گئے،

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۲۲ و ۳۵۵۔

آزاد اور خود مختار ریاست قائم ہونے کے بعد نظامِ ریاست کا قیام اس قدر مشکل نہیں تھا جس قدر کہ سماج اور معاشرہ کی اصلاح اور معاشی اور معاشرتی سدھار کے لیے نظام عدلیہ کا قائم کرنا مشکل تھا، اس معاملہ میں بھی نواب کو پوری طرح کامیابی ہوئی، ریاست قائم ہونے کے بعد ابتدائی چند برسوں کی تاریخ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں کا فوجی نظام مختارالدولہ محمود خاں کے سپرد کیا گیا تھا، رائے ہمت رائے دیوان کل ملک و مال تھے، اور داخلی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد تھیں، رائے داتارام خارجی امور اور مختلف ریاستوں کے ذمہ دار تھے۔

ریاست کے قیام کے بعد سب سے زیادہ اہم کام عدلیہ کا قائم کرنا تھا، اس لئے فوراً ہی قاضیِ شرع کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اور تمام امور کا فیصلہ اسی شرعی عدالت کے سپرد کیا گیا، معاملات فوجداری ہوں کہ دیوانی، حقوق کا معاملہ ہو یا ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا، قتل و قصاص کا فیصلہ ہو یا جرائم کی سزا کا، مال و منال کی وراثت کا معاملہ ہو یا تعزیرات کا قضیہ، باہمی نزاع ہو یا نکاح و طلاق یا بداعمالیوں کی سزا، مسلموں کے حقوق ہوں یا غیر مسلموں کی ذمہ داریاں، غرض ٹونک کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی بڑی سے بڑی ریاستوں اور حکومتوں کے مقابلہ میں ریاست ٹونک وہ واحد نمونہ کی ریاست تھی جس میں شرعی نظام کے تحت ابتدا سے نظامِ عدل قائم کیا گیا، اور فقہی نظام، اسلام کے بنیادی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ابتداء سے یہاں جاری کیا گیا، اس سلسلہ میں سب سے بڑھکر خوشی کی بات یہ ہے کہ اسوقت کا پورا ریکارڈ ابھی تک الحمدللہ محفوظ ہے، جس کے مطالعہ سے نظام عدلیہ کی پوری تاریخ مرتب ہو سکتی ہے جس کا کچھ اندازہ اس مقالہ کے آخری حصوں سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں مختصراً اس نظام کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے،

غرض ریاست کا وجود عمل میں آنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے نظم ریاست کو بڑے اعلیٰ

پیمانہ پر قائم کیا گیا، محکمۂ قضاء اور نظام عدلیہ کا قیام بھی بہت اونچے پیمانہ پر ہوا، شہر میں درس وتدریس، دینی واخلاقی سدھار، محتسبوں کا تقرر اور امامت وخطابت کا بہترین نظم کیا گیا، اور ان تمام امور کی تکمیل کے لیے لائق افراد کا انتخاب عمل میں لایا گیا ادھر اس نوبہار ریاست کے قیام کا شہرہ ملک میں ہوا جس کے نتیجہ میں نجیب آباد، نگینہ امروہہ رامپور، سنبھل اور جلال آباد وغیرہ دوسرے علاقوں سے اہل علم اور اہل فن حضرات نے اس علمی مرکز پر پہنچنا شروع کر دیا۔

ہر کجا چشمۂ بود شیریں ۔۔۔ مردم ومرغ ومور گرد آیند

نتیجہ یہ ہوا کہ دس بیس سال کی مدت میں یہ جدید ریاست علم وفضل اور فن وکمال کا گہوارہ نظر آنے لگی۔

اس وقت مقصود چونکہ یہاں کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ یہاں کے نظام عدالت اور یہاں کے فقہی نظام کی خصوصیت پر تبصرہ کرنا ہے، اس لیے دوسرے تمام پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسی ایک پہلو پر اس وقت بحث کی جائے گی،

ریاست کے قیام کے بعد جونہی علمی خاندان یہاں منتقل ہونا شروع ہوئے اور شرعی نظام جاری کرنے کے لیے عدالت عالیہ شرعیہ قائم ہوئی، اس کا قدیم ریکارڈ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر معاملہ شرعی عدالت کے سپرد کیا جاتا تھا، وہاں سے جو فیصلہ اور جو تجویز ہوا کرتی تھی، اس کا اجراء رئیسِ وقت کی جانب سے ہوا کرتا تھا، چونکہ وہ ابتدائی دور تھا، اس لئے اسوقت ان کارروائیوں میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا، دعویٰ جو ابِ دعویٰ، ثبوت اور بحث یا حلف اگر کسی پر آتا تھا تو اس کی تکمیل ساتھ ہی ساتھ ہو جایا کرتی تھی، یا بس دو ایک نشستوں میں سب تکمیلات ہو کر اجراء کے لیے معاملہ چلا جاتا تھا، حاکم عدالت کی تجویز یا فیصلہ بالکل ڈگری کی حیثیت رکھتا تھا، جس کا اجراء رئیسِ وقت کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، مسلم اور غیر مسلم حقوق میں

برابر تھے، البتہ انھیں اپنے مذہبی معاملات میں آزادی تھی، لیکن جو چیزیں سب پر اثر انداز ہو سکتی تھیں وہ غیر مسلموں کے لیے بھی ممنوع تھیں، مثلاً ایک بار ایک معاملہ پیش ہوا جب کہ ایک غیر مسلم شراب فروخت کرتے پکڑا گیا، تحقیق کی گئی، غیر مسلم نے جواب پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں چونکہ شراب جائز ہے، اس لئے میں نے اس کا کاروبار کیا ہے اب جب یہ معلوم ہو گیا کہ شراب کا کاروبار سب کے لیے ممنوع ہے اس لیے آئندہ ایسا نہیں کرونگا، اس کو اسی ہدایت کے ساتھ چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ ایسی غلطی نہ کریگا، مسلمانوں کے لیے محتسب مقرر تھے، اعمال اور افعال میں فرائض کی پابندی اور محرمات سے باز رہنے میں جہاں کوتاہی نظر آئی فوراً محتسب کی جانب سے رپورٹ پیش ہوتی اور فوراً اس کا تدارک کیا جاتا، غیر مسلموں کو ان کے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی تھی البتہ حقوق میں سب برابر تھے، فوجداری معاملات میں مجرم کو شرعی قانون کے مطابق پوری سزا دی جاتی تھی، اور یہ معاملات بھی شرعی عدالت کے سپرد تھے، قتل وقصاص اور دیت کے معاملات بھی شرعی عدالت کی نگرانی میں طے ہوا کرتے تھے۔

قیام ریاست کے بعد کون کون حضرات اس شرعی عدالت کے ذمہ دار رہے ذیل میں بالاختصار اسکی تفصیل بیان کی جارہی ہے،

جیسا کہ اس سے پہلے گذرا شرعی عدالت کے پہلے ذمہ دار مولوی محمد مفتی تھے، جو قیام ریاست کے فوراً بعد اس ذمہ داری کو سنبھال چکے تھے، ۱۲۵۹ھ تک ان کے فیصلے ریکارڈ میں ملتے ہیں، ان کے ساتھ ان کے برادر حقیقی مولانا خلیل الرحمٰن صاحب رامپوری ثم التونکی ثم گلشن آبادی کے فیصلے ملتے ہیں، چونکہ نواب امیر خان کے ساتھ کچھ مدت فوج میں بھی رہے، اور قضاء کی خدمت انجام دی، اسی طرح ٹونک منتقل ہونے کے بعد بھی اپنے بھائی کے ساتھ افتاء وقضاء کی خدمت

انجام دیا کرتے تھے، اور درس و تدریس کی بھی پوری ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے، رامپور میں انکی مسند درس پہلے سے قائم تھی، صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں، مختلف فنون میں انکی ۵ تصانیف ہیں، فقہ اور اصول فقہ میں انکے فتاویٰ، شرح ہدایہ، حاشیہ دائرۃ الوصول، شرح خطبہ، دائرۃ الوصول وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں، ان کے والد ملا عرفان رامپوری، مولانا بحر العلوم لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اصول فقہ میں ان کی شرح دوار اور مدار اگرچہ طبع نہیں ہوئی ہیں، لیکن ان کی حیات میں اہل علم میں متداول رہیں، چنانچہ نور الانوار کے حاشیہ قمر الاقمار میں ملا عرفان رامپوری کے حواشی کا متعدد جگہ ذکر ہے، اسی طرح ان کا جنگ (مجموعۃ الفتاوی یا تالیف عرفانی) مسائل پر بڑا اچھا مجموعہ ہے،

مولوی محمد صاحب المتوفی ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء کے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی عبد اللہ بن محمد جعفر صاحب نے کچھ مدت یہ خدمات انجام دیں، اسوقت نواب وزیر الدولہ کی جانب سے ناظم عدالت کے نام سے ایک عہدہ اور قائم کر دیا گیا تھا، جو عدالت کے ان فیصلوں کو جاری کرتا تھا، اسوقت نواب وزیر الدولہ کے بھائی صاحبزادہ محمد جمال خان صاحب جو نہایت نیک مزاج اور پابند شریعت انسان تھے، عدالت کے ناظم تھے، کچھ مدت کے بعد ہی نواب وزیر الدولہ کی جانب سے ہندوستان کے مشہور عالم مولوی بزرگ علی مارہروی کو مارہرہ سے بلا کر عدالت کا ذمہ دار بنایا گیا، اور قاضی القضاۃ کا عہدہ انھیں دیا گیا، لیکن ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں جلد ہی انکا ٹونک میں انتقال ہو گیا۔

ان کے بعد ان کے فرزند قاضی صدیق صاحب کو اس عہدہ پہ مقرر کیا گیا، ۱۲۷۳ھ کا ایک فیصلہ دیکھنے میں آیا اس پر صاحبزادہ محمد جمال خان کے دستخط بحیثیت ناظم عدالت اور قاضی محمد صدیق صاحب مارہروی کے دستخط بحیثیت قاضی القضاۃ تھے، قاضی صدیق صاحب کے بعد مولوی

امام الدین المتوفی ۱۹۰۱ء بھی قاضی القضاۃ رہے، ان کے بعد مندرجہ ذیل حضرات اس عہدہ پر فائز رہے۔

مولوی عبد الغفار صاحب المتوفی ۱۸۹۱ء، صاحبزادہ عبد الوہاب خان صاحب المتوفی ۱۹۴۹ء، مولوی دوست محمد صاحب المتوفی ۱۳۲۹ھ، مولوی جان محمد صاحب ۱۹۲۹ء، حکیم ظہیر الدین صاحب المتوفی ۱۹۳۹ء، مولوی بدر الدین صاحب، مولوی قاضی محمد عرفان صاحب (المتوفی ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء)۔

قاضی القضاۃ اور ناظم عدالت کی نگرانی میں، بعد کے ادوار میں مزید برآں کچھ مفتی صاحبان بھی ضابطہ میں مقرر رہتے تھے، اس طویل مدت میں تقریباً بیس پچیس حضرات نے یہ خدمت انجام دی، اسوقت مزید تفصیلات کا موقع نہیں۔

نواب امیر خان اور نواب وزیر الدولہ کے زمانہ تک ہر طرح کے نزاعات و معاملات کا فیصلہ عدالت شریعت ہی کے ذریعہ ہوتا رہا، نواب محمد علی خان نے فوجداری معاملات کے لیے ——— محکمہ نگرانی کے نام سے علٰحدہ محکمہ قائم کر دیا تھا، اس طرح بعد میں عدالت دیوانی کے معاملات ہر دو عدالتوں میں تقسیم ہوتے رہے، عدالت شریعت کے اختیارات اور مقدمات کی نوعیت محدود ہوتی رہی، جن کی وجہ سے ٹونک کی وہ خصوصیات جو دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں شرعی نظام کے تحت باقی تھیں، مفقود ہوتی رہیں، پھر بھی اپنے نظام، اپنے قانون، اپنی ہمہ گیر [illegible] اور افتاء کے اہم شعبوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ٹونک میں اس [illegible]ت کی جو خصوصیات تھیں وہ دوسری ریاستوں میں نظر نہیں آتیں۔

اب ٹونک کے کچھ اہل علم حضرات کی وہ تصنیفات جو فقہ اور اصول فقہ میں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر بھی اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ فتاویٰ مولوی حیدر علی صاحب رامپوری۔

۲۔ بیاض فقیہ (جنگ) از مولوی سعد اللہ خطیب وغیرہ از ملا عرفان رامپوری۔

۳۔ شرح الفرائض اور مفتاح المشکلات از قاضی نقیب اللہ صاحب ولایتی۔

۴۔ توضیح الاحکام از حکیم امیر حسن صاحب۔

۵۔ رسالہ رفع الیدین از مولانا حیدر علی صاحب۔

۶۔ عین الاصابہ فی رفع السبابہ از مولوی دوست محمد صاحب۔

۷۔ رسالۃ الصید از مولوی محمود حسن خان صاحب صاحبِ معجم المصنفین۔

۸۔ ضیاء البصائر للاشباہ والنظائر از قاضی نقیب اللہ صاحب۔

۹۔ کشف الحال علی التعزیر بالمال، از مولوی عبد اللہ خان صاحب۔

۱۰۔ نجم منیر نظم منار، از مولوی عبد الکریم صاحب ٹونکی۔

۱۱۔ احکام الصلوٰۃ منظوم مع کاشف الروایات شرح احکام الصلوٰۃ، از قاضی عبد الحلیم صاحب معجز۔

۱۲۔ فتح الرحمٰن فی رسم مصحف عثمان از حکیم عبد العلی صاحب ٹونکی۔

۱۳۔ زکوٰۃ الہدایہ از مولوی محمد علی صدر پوری۔

۱۴۔ زبدۃ المقاصد از مولوی سراج الرحمٰن صاحب۔

۱۵۔ فتاویٰ سعیدیہ، از مفتیان عدالتِ شرعیہ۔

۱۶۔ فتاویٰ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب۔

۱۷۔ حاشیہ دائر الوصول مولانا خلیل الرحمٰن صاحب

۱۸۔ دوار الاصول ومدار حاشیتان دائر الوصول از ملا عرفان رامپوری۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال یہ علاقہ جو کبھی علم و فضل کا مرکز تھا، یہاں علمی ذخائر کا غیر معمولی جمع ہو جانا بھی ایک فطری امر تھا،

چنانچہ ایسا ہی ہوا ــــــــ ریاستی کتب خانے ہوں یا اہل علم کے ذاتی ذخیرے، امراء کے مکتبے ہوں یا مدارس کے مخزن ہر حیثیت سے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ذخائر اس ریاست میں جمع ہوئے، یہی وجہ ہے کہ یہاں گھر گھر میں کتب خانے نظر آتے تھے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اکثر ذخائر انقلاب کی نذر ہو گئے، پھر جو ذخیرے محفوظ ہیں وہ ایک قومی اور ملکی سرمایہ ہیں اور اہل علم وارباب تحقیق کے لیے بیش بہا گنجینہ۔

ذیل میں ٹونک کے مشہور ومعروف ادارے عربی وفارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ راجستھان کے صرف فقہ واصول فقہ کے چند نوادرات کا ذکر کر کے اس مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۔ الاختیار لتعلیل المختار مصنفہ مجد الدین عبد اللہ بن محمود الموصلی المتوفی ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء جو کوفہ کے قاضی رہے ہیں، اور بغداد میں درس وتدریس وافتاء کی خدمت میں عموماً زیادہ حصہ گذارا ہے، اس کتاب کا ایک نہایت قدیم نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو رجب ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء کا لکھا ہوا ہے، محمود بن جعفر اس کے کاتب ہیں۔

۲۔ بحر الرائق شرح کنز الدقائق ابن نجیم مصری المتوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کی مشہور شرح ہے، اس کا ایک نسخہ یکم ذی الحجہ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کا لکھا ہوا ہے جو شارح سے بہت قریب زمانہ کا ہے،

۳۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، علامہ زیلعی المتوفی ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء کی مشہور شرح ہے، مکتوبہ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء کاتب محمد [illegible] بن علی بن محمد بن سلیمان المدنی ہیں۔

۴۔ اس طرح کنز اور مختصر الوقایہ کے فارسی ترجمے جو ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء اور ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء کے مکتوبہ ہیں، اس ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

۵۔ ترغیب الصلوٰۃ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں تصنیف ہوئی تھی، جس کے مرتب

کا مکتوبہ ہے یہاں محفوظ ہے، ایک قدیم نسخہ جو ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء
محمد بن احمد بن زاہد ہیں، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ جو

۶۔ جواہر اخلاطی، جو ایک مشہور اور اہم کتاب ہے، اور برہان الدین ابراہیم بن ابی بکر ابن محمد بن حسین اخلاطی کی مرتبہ ہے، اس کا ایک نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو عالمگیر کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔

۷۔ جامع الصغار، مصنفہ مجد الدین ابو الفتح الاستروشنی، المتوفی ۶۳۹ھ/۱۲۳۴ء۔ مکتوبہ رجب ۶۵۵ھ/۱۲۵۴ء کا ہے، اس کتاب میں صغار اور بچوں کے تمام مسائل جمع کیے گئے ہیں۔

۸۔ منیۃ المصلی، کی شرح حلیۃ المحلی، مصنفہ میر حاج جلی المتوفی ۸۷۹ھ/۱۴۷۲ء، اس کا ایک قدیم نسخہ محفوظ ہے، جو ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء کا مکتوبہ ہے۔

۹۔ اسی طرح خزانۃ المفتیین کے یہاں دو ایک نسخے بڑے نادر اور اہم ہیں، ان میں ایک نسخہ ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء کا مکتوبہ ہے۔

۱۰۔ خلاصۃ الفتاوی، افتخار الدین، طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری المتوفی ۵۹۲ھ/۱۱۹۵ء کی مشہور اور قدیم تصنیف ہے، اس کا ایک قدیم نسخہ ۸۱۹ھ کا لکھا ہوا یہاں موجود ہے، دو جلدوں میں ہے، اور بہت اچھا نسخہ ہے۔

۱۱۔ دستور القضاۃ، مصنفہ قاضی صدر تبریزی جو ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء کی مرتبہ ہے، اس کا ایک بہت اچھا نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو ـــــ ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲۔ شرح مجمع البحرین و ملتقی النہرین جس کے شارح ابن فرشتہ حنفی ہیں، اس کا ایک نسخہ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء کا لکھا ہوا یہاں موجود ہے۔

۱۳۔ شرعۃ الاسلام مصنفہ امام زادہ حنفی المتوفی ۵۷۳ھ/۱۱۷۷ء مکتوبہ شعبان ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء، اس طرح فتاوی سراجیہ، فتاوی زینیہ، فتاوی حمادیہ، فتاوی برہنہ، فتاوی قران خانیہ، فصول عمادی، فوائد

فیروز شاہی، مکتوبہ ۸۴۳ھ/۱۴۳۹ء، فتاوی بزازیہ، بینۃ المنیہ مکتوبہ ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء، کافی شرح وافی مکتوبہ ۷۳۷ھ/۱۳۳۶ء، مجمع الاختلافات مکتوبہ ۸۱۴ھ/۱۴۱۱ء، مختار الفتاوی، منظومۃ النسفی مکتوبہ ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء یہاں کے خاص خاص اور اہم نسخے ہیں۔

اصول فقہ کا ذخیرہ بھی یہاں الحمد للہ بہت اچھا ہے، مسلم الثبوت، اصول الشاشی، منار الانوار، حسامی اور توضیح و تلویح اور ان تمام متنوں کی شرح و حواشی کے نادر اور اچھے نسخے یہاں موجود ہیں، ان میں مندرجہ ذیل مخطوطے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ کشف الاسرار شرح اصول بزدوی مکتوبہ ۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء۔

۲۔ القواطع فی اصول الفقہ مکتوبہ قدیم۔

۳۔ حاشیہ الخفقہ فی اصول الفقہ مکتوبہ قبل از ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء۔

۴۔ حسامی مکتوبہ ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء۔

تفسیر بالرائے اور اُس کی حیثیت

از

جناب عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

قرآن مجید جہاں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر صحیفۂ ہدایت اور دستور زندگی ہے وہاں مضامین و معانی اور اسرار و حکم کا بحرِ ذخار بھی ہے، جس طرح قدرت کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں غور کرنے سے جدید انکشافات اور نت نئے منافع اور فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح قرآن میں غور و فکر کرنے سے بھی نئے نئے حقائق معلوم ہوتے رہیں گے، زمانہ علم و عقل کی خواہ کیسی ہی بلندیوں تک پہونچ جائے مگر یہ ہر مقام اور ہر بلندی پر زندگی کے پیدا شدہ مسائل میں قیامت تک انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تفکر و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے،

کتاب انزلنا الیک مبارک	مبارک کتاب ہم نے تمھاری طرف نازل
لیدبروا آیاتہ (سورہ ص ۲۹)	کی ہو تاکہ لوگ اُس کی آیتوں پر غور کریں،
افلا یتدبرون القرآن ام علی	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان
قلوب اقفالہا (سورہ محمد ۲۴)	کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں،
انا انزلناہ قرآنا عربیا لعلکم	ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے
تعقلون، (سورہ نحل ۲۴)	تاکہ تم لوگ سمجھو،

وانزلنا الیک الذکر لتبین	اور ہم نے تمھاری طرف قرآن اتارا تاکہ جو
للناس ما نزل الیہم ولعلہم	لوگوں کیلئے اتارا گیا ہے اسے بیان کر دو اور
یتفکرون (سورہ نحل ۴۴)	تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں،

جس طرح تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کو یہ شرف حاصل ہے کہ جوں ہی نازل ہوا ترتیب و تدوین اور حفظ و صیانت کے تمام مراحل طے کر لئے اسی طرح اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کے نزول کے ساتھ ہی اس کی تشریح و توضیح کا بھی آغاز ہو گیا، خود مہبط وحی الٰہی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک ارشاد اور قول و عمل اور آپ کے سنن و تقریرات قرآن کی تفسیر بن گئے، اور تفسیر کے اصطلاحی مفہوم کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس اعتبار سے بھی آپ نے قرآنی کلمات و الفاظ کی وضاحت فرمائی،

صحابہ کرام نے جہاں اپنی زندگیوں کو قرآن کی روشنی میں سنوارا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں تزکیہ و تطہیر کی منزلیں طے کیں وہاں وہ قرآن کے فہم و ادراک میں بھی دن رات کوشاں رہتے، قرآن کے معارف و حکم پر غور کرنے کے لیے صحابہ کرام کے حلقے قائم تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حلقوں کے قیام کے لئے موثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے، سنن ابی داؤد میں روایت ہے،

"جو لوگ کسی جگہ جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و مذاکرہ قرآن کی مجلیس قائم کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین اور رحمت کی بارش ہوتی ہے اور ملائکہ ان کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقہ میں اُن کا ذکر فرماتا ہے"[1]

قرآن فصیح عربی زبان میں نازل ہوا، صحابہ کرام کی زبان عربی تھی، وہ اس کی فصاحت و بلاغت

[1] سنن ابی داؤد، باب فی ثواب قراۃ القرآن،

کے رموز سے اچھی طرح آشنا تھے، جن حالات اور واقعات میں قرآن نازل ہوا، وہ اس سے بھی بخوبی واقف تھے، جن خیالات وعقائد، اعمال وافعال پر قرآن نے بحث کی ہے، وہ زیادہ تر اُن کے اپنے تھے، پچھلی قوموں کے احوال سے بھی وہ بے خبر نہ تھے، یہود ونصاریٰ کے عقائد واطوار کی طرف قرآن نے جو اشارے کئے ہیں، ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی بنا پر اچھی طرح آگاہ تھے، لیکن اس کے باوجود ہم اُن کے حالات میں پڑھتے ہیں، کہ وہ برسوں قرآن حکیم پر غور وتدبر کرتے تھے، موطا امام مالک میں ایک روایت ہے، کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورہ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے[۴۹]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی شرح مسوّیٰ میں لکھا ہے کہ:۔

"یہ اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں تبحر حاصل کریں، اسباب نزول، اور احکام میں نئے نئے استخراج کریں"

فہم قرآن میں ممتاز صحابہ قرآن کے رموز ونکات اور اُس کے اسرار وحقائق کے سمجھنے میں تمام صحابہؓ کرام یکساں نہ تھے، کچھ وہ لوگ تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے زیادہ استفادہ کیا، اور کچھ ایسے تھے جن کے استفادے کی مدت مختصر تھی، کچھ ایسی ہستیاں بھی تھیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے فہم وبصیرت اور تفسیر وتاویل میں مخصوص صلاحیتوں سے نوازا، صحابہ کرام میں جن حضرات سے تفسیری نکات منقول ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی نے دس کے نام لئے ہیں، یعنی خلفائے اربعہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ،[۵۰]

لیکن اس سلسلے میں کچھ اور صحابہ کرام کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، جیسے حضرت انس بن مالکؓ

---

[۴۹] باب سیر جمع من الصحابہ رضی اللہ عنہم [۵۰] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۷،

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہم مگر ان میں سے جن حضرات نے تفسیر کے باب میں شہرت دوام حاصل کی، اور ذخیرۂ تفسیر میں معتدبہ اضافہ کیا، اور اپنے تلامذہ کا مستقل حلقہ چھوڑا، وہ صرف چار ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ[۵۱]

دورِ رسالت کے بعد اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہوئے، تو صحابہ کرام کے تلامذہ مختلف مرکزوں میں پھیل گئے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:۔

"اہل مکہ علم تفسیر میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب وتلامذہ ہیں، جیسے مجاہد بن جبیرؒ، عطا بن ابی رباحؒ، اور عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں کے شاگرد بھی علم تفسیر میں پیش پیش ہیں، جیسے طاؤس بن کیسانؒ، جابر بن زید ازدیؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ، اسی طرح کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کو تفسیر میں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے، یہی حال مدینہ میں زید بن اسلمؒ جیسے بزرگوں کا ہے، امام مالکؒ نے انہی زید بن اسلم سے تفسیر کا علم حاصل کیا، نیز اُن کے بیٹے عبدالرحمن نے اور عبداللہ بن وہب نے بھی"[۵۲]

ان کے علاوہ مدینہ میں ابو العالیہ، محمد بن کعب القرظی، اور عراق میں علقمہ بن قیس، مسروق الاسود بن یزید، مرۃ الہمدانی، عامر الشعبی، حسن بصری، قتادہ وغیرہ وہ ممتاز تابعین ہیں جنھوں نے صحابۂ کرام سے استفادہ کے بعد تفسیریں بیان کیں، اور اُن کے ذریعہ تفسیری ذخیرے

---

[۵۱] التفسیر والمفسرون محمد حسین الذہبی جلد ۱ ص ۸۱ تا ۹۸

[۵۲] مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۱۵،

ابتدا میں تفسیروں کی نوعیت	کا سلسلہ شروع ہوا، ابتدا میں احادیث کے انداز پر تفسیری اقوال نقل ہوتے رہے،

پھر تبع تابعین کے دور میں حدیث کی کتابوں میں تفسیر کے ابواب قائم ہوئے، ہر سورہ اور ہر آیت کے متعلق جو روایت ملی، وہ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی، یزید بن ہارون (متوفی [illegible]) شعبہ بن الحجاج (متوفی ۱۶۰ھ) وکیع بن الجراح (متوفی ۱۹۷ھ) سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ)، روح بن عبادہ (متوفی ۲۰۵ھ) عبدالرزاق بن ہمام (متوفی ۲۱۱ھ) آدم بن ابی ایاس (متوفی ۲۲۰ھ) عبد بن حمید (متوفی ۲۳۹ھ) وغیرہ ائمہ حدیث کی بدولت احادیث کی کتابوں میں تفسیری روایات کا اچھا خاصہ حصہ تفسیر کے ابواب کے تحت جمع ہو گیا، پھر اس کے بعد باقاعدہ تفسیر کا فن وجود میں آگیا اور ہر آیت کی تشریح قرآنی ترتیب کے مطابق کتابی صورت میں مرتب ہوئی،

اس مرحلے میں امام ابن ماجہ (متوفی ۲۷۳ھ) امام ابن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) امام ابوبکر بن المنذر نیشاپوری (المتوفی ۳۱۸ھ) امام ابن ابی حاتم (متوفی ۳۲۷ھ) ابو الشیخ بن حبان (متوفی ۳۶۹ھ) حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) ابوبکر بن مردویہ (متوفی ۴۱۰ھ) جیسے ائمہ کرام صحابہؓ نے صحابہ، تابعین، اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں، اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی، سوائے ابن جریر الطبری کے جو ہر آیت کی تشریح کے بعد متقدمین کے اختلافات بھی درج کرتے ہیں، پھر خود ان میں ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ بھی لکھ دیتے ہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔[1]

تفسیروں میں اختلاف و تنوع	انسانی ذہن و فکر میں ہمیشہ ارتقاء ہوتا رہتا ہے، اور تاریخ

[1] التفسیر والمفسرون ص ۱۴۰ تا ۱۴۲،

کے ہر موڑ پر ذہنی اور فکری تغیرات ہوتے رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہد صحابہؓ میں ہر شخص کے غور و فکر کے انداز میں کچھ نہ کچھ فرق رہا، اختلاف طبائع اور صلاحیتوں کے اعتبار سے قرآن حکیم میں جب انھوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا، تو اختلاف و تنوع کا پیدا ہونا ناگزیر تھا بعض صحابہ کرام نے قرآن کی آیت کا مطلب سن کر یا آپ سے سنے بغیر بیان کر دیا اور بعض نے دو قول سنے یا کوئی عمل دیکھا، اسے روایت کر دیا، یا ان دونوں کو بیان کر دیا، پھر جب نئے مسائل و معاملات پیدا ہوئے، اور ان کے لئے استنباط و استخراج کی ضرورت پیش آئی تو جس صحابی کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا جو سرمایہ محفوظ تھا، اور اس نے جیسا کچھ سمجھا تھا، اس کی روشنی میں اس نے جدید امور و معاملات کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دی، اس طرح اب اختلاف رونما ہونے لگا، اور احکام و مسائل میں تنوع اور مختلف نقطۂ نظر سامنے آنے لگے، اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ارشاد حقیقت پر مبنی ہے،

> "میں نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا، کیونکہ اگر فروعی مسائل میں صحابہ کا ایک ہی قول ہوتا، تو لوگوں کو بڑی دشواری ہوتی، صحابہ کرام ائمۂ دین تھے، جن کی پیروی موجب خیر و برکت اور باعث فلاح و نجاح ہے اس بنا پر کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کو سنت تصور کیا جائے گا"[2]

عہد تابعین میں اختلاف کا دائرہ اور وسیع ہوا، دوسری قوموں کے افراد حلقہ بگوش اسلام ہوئے، معیشت و معاشرت میں تبدیلیاں ہوئیں، سیاسی و سماجی تغیرات رونما ہوئے، نئے نئے خیالات و رجحانات پیدا ہوئے، ان حالات میں اسلامی وحدت فکر اور بے لوث ذہنی اجتہاد و استنباط کی فضا اپنی اصلی شکل میں قائم نہ رہ سکی، فکر و نظر میں انتشار کے باعث متعدد

[2] الاعتصام للشاطبی جلد ۳ ص ۱۱،

مکاتبِ فکر کا ظہور ہوا، ان مکاتب فکر کا دامن اتنا بڑھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور بنیادی عقائد مثلاً صفاتِ باری، خلقِ قرآن، جبر و قدر، ایمان و عمل کا تعلق، خیر و شر کی حقیقت، مرتکبِ کبیرہ کا حکم وغیرہ بھی تفسیروں میں موضوع بحث بن گئے، اور اس بحث و جدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کرلی، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح ہر فرقہ اپنے میلان و رجحان کے مطابق کرنے لگا،

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں مختلف علمی تحریکیں بھی پیدا ہوئیں، صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، کلام اور تصوف کا رواج ہوا، ان علوم کے حاملین نے اپنے اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں، علم و ادراک کے گوشوں میں جلا آئی، اور ارتقاء و تغیر کے تقاضے بروئے کار آئے، اور روایات کے ساتھ اجتہاد کا بھی دروازہ کھل گیا، تفسیروں میں جہاں تنوع، رنگا رنگی آئی، وہاں قرآن مجید کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایک باب کھل گیا جس سے قرآن مجید فقہی، کلامی اور فلسفیانہ بحثوں کا میدان بن گیا۔ ہر مفسر کوشش کرنے لگا کہ وہ جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیت سے ثابت کرے، اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے،

تفسیر بالرائے کی ممانعت،

ارتقاء کے اس موڑ پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ تفسیر کے صحیح حدود کیا ہیں، اور قرآن میں غور و فکر اور استخراجِ معانی کا دائرہ کتنا وسیع ہے،؟ اس سلسلے میں دو گروہ ہوگئے، ایک فریق تو اس بات کا حامی تھا کہ تفسیر میں ماثور و مسطور ہی پر اکتفا کیا جائے، اور اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہی جائے، کیونکہ اس سے غیر ضروری بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے، اور ایمان کے داعیوں اور تقاضوں کو نقصان پہنچتا ہے، اس فریق کے نزدیک

تفسیر میں صرف ماثور کا اعتبار کیا جائے گا، اور مجرد رائے کو حرام سمجھا جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَنْ قَالَ فِی الْقُرآنِ بِغَیرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ[1] — قرآن مجید کے بارے میں بغیر علم کے جس نے کچھ کہا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ،

من قال فی القرآن برائہ فاصاب فقد اخطاء،[2] — جس نے قرآن کے سلسلے میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اور اس کی بات صحیح بھی ہوئی تو اس نے غلطی کی،

اصحابِ حدیث و روایت کے نزدیک وہ شخص خاطی اور گمراہ ہے جو تفسیرِ رسولؐ سے گریز کرکے اپنے جی سے قرآن مجید کی کوئی تفسیر کرے، اس قسم کی تفسیر بالرائے سے گمراہیوں کا دروازہ کھل گیا، اور باطنیہ، شیعہ، معتزلہ، خوارج، مرجئہ وغیرہ مختلف گمراہ فرقے پیدا ہوگئے جنھوں نے قرآن کے ظاہر و باطن کے معنی الگ، الگ قرار دیئے، بعد میں بدعت اور غرض پرستی بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی، اس لئے بے شمار مفاسد پیدا ہوگئے،

لیکن بعد کے دور میں نئے نئے مسائل نے نئی نئی الجھنیں پیدا کردیں جن کے ازالہ کے لئے اصحابِ روایت کے پاس کوئی حربہ نہ تھا، بالخصوص جب مسلمانوں میں یونانی علوم و فنون کا رواج ہوا، اور ان کے عقائد و افکار دوسری قوموں سے متاثر ہوئے، تو اس وقت ان

---

[1] ترمذی: یہ حدیث امام ترمذی کے نزدیک غریب ہے، اس کے ایک راوی سہیل بن حزم کے بارے میں کلام کیا گیا ہے،

[2] مشکوٰۃ و جامع ترمذی

مشکلات اور الجھنوں کا عقلی جواب دینے کی ضرورت پیش آئی جس کے لیے علمائے اسلام کا ایک گروہ آگے بڑھا، اس زمانہ میں عقلی تفسیروں کی افادیت محسوس کی گئی، اس کے نتیجہ میں امام رازی، بیضاوی، نسفی، خازن، ابو حیان، نیشاپوری، سیوطی، شربینی، ابو السعود اور آلوسی نے گو عقلی تفسیریں لکھ کر تفسیر و تاویل کے دائروں کو کافی وسعت دی، لیکن اثر و روایت کے جادۂ مستقیم سے انحراف نہیں کیا، ان کی کتابوں میں جو فرق و اختلاف پایا جاتا ہے، وہ ان کے اپنے اپنے ذوق اور طریقہ تعبیر کی وجہ سے ہے،

حالات کی تبدیلی سے متکلمینِ اسلام کے گروہ نے یہ محسوس کیا کہ عقل و رائے کے بغیر کام نہیں چلے گا، قرآن تو ایک ابدی صحیفہ ہے، جس کی تعبیر و تشریح ہر دور کے حالات اور جدید علوم و فنون کے اعتبار سے کی جائے گی، اس نے خود بار بار تدبر و تعقل کی دعوت دی ہے، اس لئے لامحالہ ہر دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھکر ہی اس کی تفسیر بھی کرنی چاہئے،

رائے کی قسمیں

تفسیر بالرائے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے مطالب و معانی کے سمجھنے میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے، اگر یہ مطلب ہوتا، تو پھر قرآن فہم و تدبر کی تلقین کیوں کرتا، اس طرح تو قرآن کا درس و مطالعہ بھی بے سود ہو جاتا، علامہ شاطبی نے موافقات میں تحریر فرمایا ہے، کہ

"رائے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ رائے جو کتاب و سنت کے مطابق اور عربی زبان کے قواعد کے موافق ہو، اس رائے سے اعراض اور غفلت ممکن نہیں ہے، دوسری وہ رائے ہے جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہو اور نہ کلام عرب کے قواعد کے مطابق ہو، اس قسم کی رائے بلاشبہ قابل مذمت ہے"[1]

ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ

[1] موافقات للشاطبی جلد ۳،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد من قال فی القرآن برائہ فاصاب فقد اخطاء اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اس کے خیال میں آجائے اور اگر کوئی شخص آیات قرآنیہ کا مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے جن پر سب کا اتفاق ہے، تو وہ شخص قابل تعریف اور اجر کا مستحق ہے، اور وہ ان لوگوں میں ہے، جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا ہے:۔

لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم[1]"

تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص اصطلاح ہے، اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اپنے ذہن میں ٹھہرالی جائے، اور کسی طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جائے،

تفسیر بالرائے کے متعلق علماء کی تصریحات

تفسیر بالرائے کا مطلب کیا ہے، اور شارع علیہ السلام کا اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے علمائے اسلام کی مندرجۂ ذیل تصریحات قابلِ غور ہیں، علامہ قرطبی اندلسی فرماتے ہیں:۔

"کسی معاملہ میں آدمی کی خود اپنی ایک رائے ہو، اور اس کی جانب خواہش نفس کی بنا پر اس کا طبعی میلان بھی ہو، اور وہ اپنی اسی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی اس لئے تفسیر کرے، کہ اپنی غرض فاسد کی صحت پر استدلال کر سکے"[2]

علامہ خازن لکھتے ہیں:۔

"تفسیر بالرائے کی ممانعت اس شخص کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو اپنی خواہش نفس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے، جیسے کوئی شخص اپنی بدعت کا جواز ثابت کرنے

[1] احکام القرآن جلد ۲ ص ۸۸ [2] تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۳۳

کے لئے قرآن کی بعض آیتوں سے استدلال کرے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ
آیت کا مطلب کچھ اور ہی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ مقابل کو ایسی چیز سے
دھوکا دے جو اس کی بدعات کے دلائل کو مضبوط کرے، جیسا کہ باطنیہ، خوارج اور
دوسرے گمراہ فرقے اپنی اغراض فاسدہ کے لئے کرتے ہیں۔[1]

امام غزالی نے تفسیر بالرائے کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:۔
یہ کہ زیر بحث آیت کے موضوع سے متعلق کسی شخص نے پہلے سے کوئی رائے قائم
کر لی ہو، اور اس کی جانب اس کا میلان و رجحان ہو، پھر وہ آیت قرآنی کی تاویل
میں اس طرح کھینچ تان کرے، کہ وہ اس کی رائے کے مطابق ہو جائے، اور اپنی
صحیح غرض کے لئے اس سے حجت اور دلیل قائم کر سکے، اور اگر اس کی مخصوص
رائے اور رجحان کا سوال نہ ہوتا، تو پھر وہ آیت زیر بحث کی تفسیر و تاویل
کی طرف توجہ بھی نہ کرتا، بالعموم یہ تفسیر بالرائے اس علم کے ساتھ ہوتی ہے، کہ
آیت زیر بحث کی تفسیر مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اپنی بدعت کو صحیح اور جائز ثابت
کرنے کے لئے حریف کو التباس میں مبتلا کر کے وہ آیاتِ قرآنی سے حجت لاتا ہے، اور
کبھی یہ تفسیر بالرائے جہالت پر بھی مبنی ہوتی ہے، اور آیت زیر بحث اگر محتمل ہوتی
ہے یعنی اس سے دونوں پہلو ثابت ہو سکتے ہیں تو اس کی فہم اپنے اغراض کے توافق
پر مائل ہوتی ہے، اور آیت کا مفہوم اپنی غرض اور خواہش کے سانچہ میں ڈھالنے کی
کوشش کرتے ہوئے اپنی رائے کے جانبدارانہ پہلو کو ترجیح دیتا ہے، اور اس طرح
وہ تفسیر بالرائے کا ارتکاب کرتا ہے، یہ وہ رائے ہے کہ اگر پہلے سے اس نے
قائم نہ کر لی ہوتی، تو وہ تفسیر کا یہ پہلو اختیار نہ کرتا، لوگوں کو بہکانے اور اپنے

[1] تفسیر خازن جلد ا ص ۲۷

مذہب باطل کی ترویج کے سلسلے میں اس طرز عمل کو باطنیہ نے خوب استعمال کیا، انھوں
نے قرآن کو اپنی رائے اور مذہب کے موافق ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں کیا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آیات قرآنی کا جو مفہوم یہ لے رہے ہیں
وہ قطعاً مراد نہیں ہے، یہی وہ مواقع ہیں جہاں تفسیر بالرائے ممنوع ہے، کیونکہ
ایسے مواقع پر "رائے" سے مراد رائے فاسد ہے، جو ہوا و ہوس سے تو مطابقت
رکھتی ہے، لیکن اجتہاد صحیح سے جسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔"[1]

تفسیر بالرائے کے حدود

بہر حال تفسیر میں رائے بالکلیہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ اگر رائے محمود ہو
تو اس سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی پہلو روشن ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ تفسیر کرنے والا شخص
دینی علوم پر گہری نظر رکھتا ہو، عربی زبان کے قواعد اور اسالیب پر اسے عبور بھی ہو، بلاغت و
معانی کی باریکیوں کو بھی سمجھتا ہو، احادیث و آثار کے ذخیرہ سے بھی واقف ہو، اور سب سے بڑی
بات یہ ہے کہ اس کے دل میں نور ایمان ہو، تقویٰ و خلوص نیت سے بھی بہرہ یاب ہو تو ایسا شخص
کسی آیت کا مفہوم بیان کرے تو اس کی تفسیر، تفسیر بالرائے نہ ہوگی، چنانچہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"جس نے قرآن کی تفسیر میں لغت اور شریعت کے اعتبار سے اپنے علم کے مطابق
گفتگو کی، اس پر کوئی حرج نہیں، اسی لئے ان سلف سے اور بعد کے علماء سے تفسیر
میں بہت سے اقوال منقول ہیں"[2]

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں:۔

"جس نے غور و فکر سے کام لیا، اور علم و نظر کے اصولوں کے مطابق قرآن کی
تفسیر کی، وہ اس حدیث میں داخل نہیں، اس کی تفسیر بالرائے نہیں ہوگی، اور

[1] احیاء العلوم جلد ا ص ۲۶۱ - [2] تفسیر ابن کثیر جلد ا ص ۶

نہ خطا کی طرف منسوب ہوگی؛[51]

اہلِ نظر کے نزدیک آیات کی تاویل بھی جائز ہے، اور تاویل کا تعلق زیادہ تر عقل و رائے ہی سے ہے، علامہ سیوطیؒ امام بغوی اور کواشی سے نقل کرتے ہیں کہ

"تاویل یعنی آیت کو اجتہاد و استنباط کے طریق پر ایسے مفہوم پر محمول کرنا جو سیاق و سباق کے مطابق ہو اور آیت میں اس کی گنجائش ہو، اور وہ مفہوم کتاب و سنت کے خلاف بھی نہ ہو، علمائے تفسیر کے لئے ناجائز اور ممنوع نہیں ہے"۔[52]

بہرحال رائے محمود بھی ہو سکتی ہے اور مذموم بھی، اگر اصول و ضوابط کے تحت ہو تو اس سے فہم قرآن کی راہیں کھلتی ہیں، اور اگر اُن سے انحراف ہو تو بیجا تاویلات کا بھی دروازہ کھلتا ہے، محتاط مفسرین نے تفسیر بالرائے کے حدود کا ہمیشہ لحاظ رکھا ہے، اور ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت تفسیر کے ذخیرہ میں گرانمایہ اضافہ ہوا،

تفسیر بالماثور کا کمزور پہلو

اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ تفسیر بالماثور ہمارے لئے کافی ہے اور ہمیں عقل و فہم کو کام میں نہیں لانا چاہئے، تو یہ اس کی کوتاہ فہمی ہے، قرآن پر جب بھی غور و فکر کیا جائے گا، اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا تو تفسیر بالماثور زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہوگی اور نہ ہر زمانہ اور ماحول میں سازگار ہوگی، کیونکہ حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں تفسیر کے ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں، اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں

[51] البحر المحیط جلد ۱ ص ۱۳،

[52] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۰،

مگر ان سے خوان کا کوئی گوشہ سیراب نہیں ہوتا، علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان فی علوم القرآن" کی آخری فصل میں ان تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے، جو صحابہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اور وہ کل اُن کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں، پھر وہ بھی زیادہ تر الفاظ کے معانی کے متعلق ہیں،

ان کے علاوہ تفاسیر کے وہ مجموعے جن میں آثار و اقوال کو جمع کیا گیا ہے، ان میں ہر قسم کی روایات درج ہو گئی ہیں، ائمہ جرح و تعدیل نے جب راویوں اور روایتوں کی جانچ کی، تو تفسیری روایات کا بڑا حصہ اُن کے رواۃ کے ضعف کی بنا پر مشکوک ثابت ہوا، کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی، محمد بن مروان، بشر بن عمارہ، اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جانچنے سے کمزور بلکہ ان میں سے بعض وضاع نکلے،[53]

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایات زیادہ تر موضوع ثابت ہوئیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کی ہر آیت اور ہر لفظ کی تفسیر میں ۱۲۶۰ روایتیں نقل کی گئی ہیں، جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں، جو صحیح مانی گئی ہیں[54]۔

پھر منقولی تفسیروں میں اسرائیلیات کا بڑا حصہ بھی شامل ہو گیا، جن میں زیادہ تر حصہ موضوعات و خرافات سے تعلق رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر ائمہ نے ان پر سخت تنقیدیں کیں، امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے،

"تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم، اور تفسیر"[55]

[53] مرآۃ التفسیر ص ۳۰ تا ۲۸ - [54] الاتقان جلد ۲ ص ۱۹۵ - [55] تذکرۃ الموضوعات شیخ محمد بن طاہر ص ۸۳،

تفسیر میں اجتہاد و رائے کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تفسیر کا صرف کچھ ہی حصہ ہم تک پہنچا ہے، تو باقی حصے کے بارے میں نصوص صریحہ کی روشنی میں ہم قرآن سمجھنے کی کوشش کریں،

صحابۂ کرام سے جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں لا محالہ اسے اُن کی فہم و رائے ہی قرار دیا جائے گا اور جب انھوں نے ایک طرح ڈال دی ہو تو ہم بھی اُن کے راستہ پر چلیں جس طرح فقہی مسائل میں ہم ان سے استفادہ کرتے، اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں، اسی طرح قرآن کے سلسلے میں بھی ہم اپنی فہم و رائے سے کام لیں،

ان اقوال میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے نہیں ہیں، ظاہر ہے وہ صحابۂ کرام کا اپنا فہم سمجھے جائیں گے، جسے اللہ تعالیٰ نے فہم و خرد سے نوازا ہے، اور لغت و سنت کا وہ علم بھی رکھتا ہے، تو وہ بھی صحابۂ کرام کی تقلید کرتے ہوئے اپنی فہم سے کام لے سکتا ہے،

تفسیر بالماثور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سختی کے ساتھ آثار سلف سے تجاوز نہیں کرتے، وہ بھی سلف کے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر استنباط و ترجیح سے کام لیتے ہیں اور یہ اختیار و تمیز فہم بالرائے کے سوا اور کیا ہے،

جب یہ ثابت ہے کہ تفسیر بالماثور کا بہت کم حصہ صحیح طریقہ پر پہنچا ہے، تو دوسرے حصوں کے لئے فہم و رائے کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا، اخبار و آثار سے بھی تائید ہوتی ہے کہ اصحاب فہم و تدبر کے لئے قرآن میں غور و فکر کی کافی گنجائش ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کوئی ایسی چیز نہیں عطا فرمائی جسے لوگوں سے چھپایا ہو، سوائے اس کے کہ اللہ عزوجل اپنے کسی بندے کو فہم قرآن

کی نعمت عطا فرمائے[۱]"

مقصد یہ ہے کہ کتاب اللہ کی فہم کا دروازہ وسیع ہے، خدا جسے چاہے عطا کرے، اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو ہمیشہ یہ نعمت حاصل ہوتی ہے، اولوالالباب اپنی حکمت و بصیرت قرآن سے استنباط کرتے، اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کے علم و معرفت میں استعمال کرتے ہیں،

فہم قرآن کے سلسلے میں اہل علم کا یہی طریقہ رہا ہے، کہ پہلے انھوں نے قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ قرآن ایسی کتاب ہے، جس میں کہیں اجمال ہے، تو کہیں دوسری آیت میں اس کی تفصیل ہو جاتی ہے، اس کے بعد انھوں نے سنت کو ذریعۂ فہم بنایا، کیونکہ رسول شارح قرآن ہیں، پھر اقوال صحابہ کو پیش نظر رکھا، کیونکہ انھوں نے براہ راست صحابہ سے استفادہ کیا، پھر تابعین کے اقوال کو بھی دیکھا، پھر جب اشکال رہ گیا تو انھوں نے فکر و رائے سے کام بھی لیا، یہی طریقہ زیادہ محتاط اور اولیٰ ہے، اور اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یمن بھیجتے ہوئے سوال کیا کس چیز سے فیصلہ کرو گے، معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کی کتاب سے، فرمایا اگر اس میں نہ مل سکے؟ عرض کیا تو سنت سے۔ فرمایا کہ اگر سنت میں بھی نہ پایا؟ عرض کیا تو پھر اجتہاد و رائے سے کام لوں گا، یہ سن کر آپ نے سینہ پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا، الحمد للہ جس نے رسول کے قاصد کو اس امر کی توفیق بخشی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے[۲]"

ارباب علم کے لئے زندگی کے ہر باب میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا اسوہ قابل حجت رہا۔ تو فہم قرآن کے سلسلے میں یہ دلیل راہ کیوں نہ بنے، حقیقت یہ ہے کہ فہم قرآن کا دائرہ تنگ نہیں ہے، بلکہ قرآن کی حکیمانہ اور ابدی تعلیمات کا تقاضا ہے، کہ اس میں ہمیشہ تعقل و تفکر سے کام لیا جائے

---

[۱] مشکوٰۃ بتخریج کتاب القصص ص ۳۰۰، بحوالہ بخاری ۵۲ جامع ترمذی کتاب القضا

جتنی زیادہ گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا، اسی قدر خدا کی حکمت و معرفت کی دولت ہاتھ آئے گی، اس سلسلے میں امام غزالیؒ نے بڑی اچھی بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

"قرآن کریم میں جملہ دینی علوم موجود ہیں، بعض صراحت کے ساتھ، بعض اجمالی طور پر، بعض نسبتاً تفصیل سے، لیکن ان سے بہرہ ور ہونے کے لئے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے، نیز حقائق کی بصیرت بھی لازمی ہے، اور یہ کام صرف اس طرح نہیں ہو سکتا کہ زبان سلف پر جو ظواہر تفسیر چلے آرہے ہیں، اُن پر اکتفا کر لیا جائے، بلکہ ضروری ہے کہ تعمق سے کام لیا جائے، اور استخراج معانی کیا جائے، بشرطیکہ وہ تفسیر ماثور کے خلاف نہ ہو"،

لیکن بہت سے امور ہیں جو تفسیر ماثور سے ماوراء ہیں، جیسا کہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

من اراد علم الاولین والآخرین	جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اولین و آخرین
فلیتدبر القرآن،	کا علم حاصل کرے اسے چاہئے کہ قرآن میں [۲]

اور ظاہر ہے کہ تدبر فی القرآن کے لئے تعمق فی الفہم ضروری اور ناگزیر ہے، جو ظاہر الفاظ و معانی پر انحصار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لئے اشارات اور مقاصد کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال کا بیان بھی ہے اور اس کی ذات قدسی کا ذکر اس کے اسمائے حسنیٰ بھی آئے ہیں، ان چیزوں کو سمجھنے کے لئے فانی چیزوں کی مشابہت سے تنزیہ کے ساتھ ساتھ صرف ظواہر پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ فہم و تدبر کی بھی ضرورت ہے تاکہ بیانات کو جمع کیا جا سکے اور قول مختلف کی نفی کی جا سکے،

۳۔ آثار سلف بھی اس مسلک کی تائید میں موجود ہیں کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے فہم و تدبر سے کام لینا چاہئے، چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے،

"جس نے قرآن کو سمجھا اس کے ہاتھ میں سارے علوم کی کنجی آگئی"

ظاہر ہے یہ بات اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک فہم میں تعمق سے کام نہ لیا جائے،

۴۔ خود قرآن کی آیات تعمق فی الفہم کی دعوت دیتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ	اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر
خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ (البقرۃ۔ ۳۷)	دیا گیا،

مفسرین سلف حکمت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے معنی فہم قرآن کے بیان کئے ہیں، تو جب اللہ تعالیٰ خود فہم قرآن کو خیر کثیر سے تعبیر فرماتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کس طرح وہ ان لوگوں کو جو فہم و تعمق پر قادر ہیں، بحث و تامل اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو دعا دی،

اللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ	اے خدا ابن عباسؓ کو دین کی سمجھ اور
التَّاوِيْلَ، [۱]	تاویل کی فہم عطا کر،

تاویل سے مراد قرآن کی تفسیر ہی ہے، اور اس کی عبارت اور غایت کے اشاروں کو سمجھنا، اور اگر تفسیر محدود ہوتی، صرف اقوال تک محدود ہوتی تو آپ ابن عباسؓ کے لئے علّمہ (اسے سکھا دے) کے بجائے (احفظہ) "اسے یاد کرا دے" فرماتے،

تفسیر کا صحیح طریقہ

تفسیر قرآن میں نہ تو صرف نقل و روایت پر انحصار کرنا درست ہے، نہ مجرد رائے اور عقل پر اعتماد کرنا مناسب ہے، بلکہ صحیح اور معتدل راہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح طریقہ سے مروی ہے اس پر اعتماد کیا جائے، اور اپنے نزعوات اور بیجا تاویلات سے احتراز کیا جائے، علامہ راغب اصفہانی دونوں فریقوں کے دلائل لکھنے

۱؎ فتح الباری جلد ۱ ص ۸۰، ۲؎ احیاء العلوم ص ۲۶۰ تا ۲۶۲، جلد ۱،

کے بعد اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

غلو اور کوتاہ فہمی دونوں فریقوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جس نے صرف منقول پر انحصار کر لیا اس نے ان تمام پہلوؤں سے صرف نظر کر لیا جن کی آئندہ ضرورت پڑتی ہے اور جس نے اجازت دی اس نے ہر اہل و نااہل کے لئے غور و خوض کی اجازت دیدی جس نے اپنی غرض کیلئے اس کی تفسیر بیان کرنی شروع کر دی اور اس نے آیت تدبر کا لحاظ نہیں کیا[51]

امام غزالی بھی فرماتے ہیں:-

"اس افراط و تفریط سے بچنے کے لئے صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ فہم قرآن کے سلسلے میں جو کچھ مروی اور ماثور ہے، اس پر اعتماد کیا جائے لیکن منقولات اور دلائل نقلیہ کے پہلو بہ پہلو فہم و عقل کو کام میں لانا چاہئے تاکہ قرآن کریم کے دور رس، وسیع اور گہرے معانی کا استخراج کیا جا سکے اور کونی و نفسی حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب کر گوہر مقصود کو حاصل کیا جائے۔ ظواہر کونیہ کا ادراک عقل اگر صحیح طور پر کرے گی تو قرآن میں بہت اشارے بھی ضرور ملیں گے، شاید یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض صحابہ نے اشارہ فرمایا ہے"

مثلاً حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں:

لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتی یجعل للقرآن وجوھاً[52]	کوئی شخص فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ قرآنی الفاظ کے مختلف استعمالات کا علم نہ حاصل کرے

حافظ ابن حبان ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

ان للقرآن ظاھراً و باطناً	قرآن کے ظاہری معانی بھی ہیں اور باطنی بھی

[51] تفسیر راغب ص ۳۲۳ [52] الاتقان جلد ۱ ص ۱۴۱،

وحداً و مطلعاً ،	بھی، حلال و حرام بھی اور وعدہ و وعید بھی

یہاں قرآن کے دوسرے پہلو یعنی باطن سے وہ باطن نہیں مراد ہے جو حضرات شیعہ کے نزدیک صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصیا کے ساتھ خاص ہے بلکہ اس سے قرآن کا وہ اشاریہ جانبہ مراد ہے جو حقائق کونیہ نفسیہ و تشریعیہ وغیرہ سے متعلق ہے یعنی وہ امور ہیں جنہیں کوئی دقیقہ رس عالم ہی اپنی بصیرت کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے، وہ بصیرت جو نور الٰہی سے مستفید ہو اور جو استقامت فکر اور عقل رسا کی حامل ہو۔

امام غزالیؒ نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"ظاہر تفسیر میں نقل و سماع لابدی اور لازمی ہیں تاکہ انسان غلطی اور کجی سے محفوظ رہے، اس کے بعد ہی انسان وسعت فہم و ادراک اور استنباط و استخراج سے آشنا ہو سکتا ہے، جو شخص اسرار قرآن کے فہم کا دعویٰ کرتا ہے اور تفسیر ظاہر سے نا آشنا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دروازے میں سے گزرے بغیر اندرون خانہ پہنچ جانے کا مدعی ہو یا جو کہتا ہو کہ میں ترکوں کا کلام سمجھ لیتا اور ان کے مقاصد پہچان لیتا ہوں حالانکہ وہ ترکی زبان سے نا آشنائے محض ہو۔"

اسرار قرآن اور اسی کے باطنی پہلو کے فہم و ادراک کے بارے میں آگے چل کر امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"یہ اسرار الٰہی علماء پر منکشف ہوتے ہیں جن کا علم راسخ ہے، وہ بھی بقدر علم و صفائے قلب، اور علم و صفائے قلب کی ترقی کی بھی ایک حد ہے، ورنہ تمام اسرار قرآنی کا سمجھ لینا ناممکن ہے اگرچہ سمندر روشنائی اور اشجار قلم کیوں نہ بن جائیں کیونکہ اللہ عز و جل کے کلمات کے اسرار و حکم کی کوئی انتہا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ظاہر تفسیر میں اشتراک معرفت کے باوجود فہم قرآن کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ تفسیر کا صرف ظاہری پہلو دوسرے پہلوؤں سے انسان کو بے نیاز نہیں کر سکتا"[53]

[53] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۲۶۲، ۲۶۳ و ۲۶۴،

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی
میں
قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا بہت بڑا دینی کارنامہ ہے، اس کے بانی اور روح رواں ہمدرد دواخانہ کے مالک جناب حکیم عبد الحمید صاحب ہیں، جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی گئی گذری حالت میں ایسے نمایاں کام انجام دیے ہیں جن پر ہندوستانی مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یونانی طب کی حالت اچھی نہ تھی، لیکن جناب عبد الحمید نے اپنے والد بزرگوار کے ہمدرد دواخانہ کو اپنی نگرانی میں لے کر اس میں ایسے چار چاند لگائے کہ اب اس کی دوائیں اور دوسری تیار کردہ چیزیں ظاہری اور معنوی حیثیت سے یورپ کی دواؤں کے مقابلہ میں ہو گئی ہیں، انھوں نے ہمدرد دواخانہ کو جو ترقی دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں اتنی برکت ہوئی کہ اس کی آمدنی سے تغلق آباد میں ایک بہت ہی وسیع اور عریض رقبہ خریدا، اور اس بنجر اور پتھریلی زمین میں وہ کارنامہ انجام دیا جو اکبر نے فتح پور سیکری آباد کر کے دکھایا تھا، اکبر کے پاس شاہی خزانہ تھا، لیکن جناب عبد الحمید صاحب کے پاس شاہانہ دل ہے، اب اس کے احاطہ میں ایک طبیہ کالج ہے، جس کا ایک اسپتال اور دار العمل بھی ہے، مگر جو چیز سب سے نمایاں اس رقبہ میں ہے وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا کتب خانہ ہے، جو فن تعمیر کی

ندرت اور اپنی آرائش و زینت کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ کے بڑے سے بڑے کتب خانوں پر بھی اپنی انفرادیت کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے، اس احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں ہیں جن کی قیمت اگر موجودہ دور میں لگائی جائے تو شاید کھربوں میں طے ہو۔

حکیم عبد الحمید صاحب کی کیا عمر ہے؟ وہی ہے جس میں عام طور سے لوگ بوڑھے پھوس کہلاتے ہیں مگر ان کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؂

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب

وہ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں، مگر اپنی خاموشی میں معلوم نہیں کیا کیا سوچتے رہتے ہیں ؂

گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

دوسری بین الاقوامی کانگریس کے خضر راہ وہی تھے، ان کی اعانت کے لیے ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید صاحب کراچی سے آئے ہوئے تھے، جن کو ایسے علمی اجتماع کو انتہائی خوش سلیقگی سے انجام دینے میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اور جب بھی موسم ہوتا ہے، چاند کی چاندنی سے زیادہ سفید اور سہانے رنگ کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے اپنی ہنسی اور خوش خلقی کی افشاں پاشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان کے جلو میں پروفیسر ایس۔ ایم۔ ایچ جعفری تھے، جو اس وقت آسٹریلیا میں پروفیسر ہیں، لیکن حکیم سعید کے خلوت و جلوت میں ہمدم اور دمساز ہیں، وہ کانگریس کو ہر طرح کامیاب بنانے میں حکیم سعید صاحب کی ہر طرح کی مدد کر رہے تھے، حکیم سعید صاحب میں بڑی مردم شناسی بھی ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس سے کیا کام کس وقت لیا جا سکتا ہے، جناب برکات احمد صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس بھی ان کے ساتھ ہر طرف دکھائی دیے، اگر کام کے بارے سے جو سب سے زیادہ دبے اور تھکے دکھائی دیے، وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر جناب سید اوصاف علی تھے، جو متحرک ہو کر تھکنا نہیں جانتے اور اگر تھک بھی جاتے ہیں تو اس کا اظہار نہیں کرتے، دنیا بھر کے

سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے ان میں بڑی خوش مذاقی پیدا ہو گئی ہے، جس کا اظہار ان کی ہر گفتگو اور تقریر، ہر نشست و برخاست، ملنے ملانے اور خاطر تواضع کرنے میں ہوتا ہے، ان کو کوئی کھرچے تو ان کے ہر بن مو سے مشرق اور مغرب کی ہر نئی پرانی تصنیف کی آواز سنائی دے گی، کانگریس کے ہر گوشہ اور ہر کام میں وہ چھلاوہ کی طرح دکھائی دیئے،

کانگریس کے انعقاد کے لیے کوئی خاص تزک و احتشام کی ضرورت نہ تھی، جو بھی زینت و آرائش کی جاتی وہ اس احاطہ کی شاندار لائبریری کے سامنے ماند پڑ جاتی، البتہ لائبریری کی عمارت کی دیواروں اور چھتوں پر اسمائے حسنیٰ کی کتابت کا جو آرٹ پاکستان کے مشہور مصور جناب صادقین نے دکھایا تھا وہ اس موقع کی زیبائش کے لیے بہت ہی خوب، مناسب، موزوں اور دیدہ زیب تھا۔

اس کانگریس کا اجلاس ۱۲؍ دسمبر سے ۱۷؍ دسمبر ۱۹۸۲ء تک ہوتا رہا، اس کا پہلا اجلاس آسٹریلیا میں ہوا تھا، دو سال کے بعد جناب حکیم عبد الحمید نے اس کی میزبانی کی ساری ذمہ داری لے کر اس کا دوسرا اجلاس اپنے یہاں منعقد کیا، اس کی اہمیت کا اندازہ ان نمایندوں سے ہو گا جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

آسٹریلیا: ڈاکٹر احمد شیبول، سڈنی یونیورسٹی، احمد یوسف، ملبورن، ڈاکٹر محمد واصل کوئنز لینڈ۔

آسٹریا: ڈاکٹر اسماعیل بالوک

امریکہ: پروفیسر فریڈرک ام ڈینی، ڈاکٹر عبد و اے۔ ایل کھولی، ڈاکٹر ٹی۔ بی اروِنگ، پروفیسر ڈیوڈ اے کنگ، پروفیسر منظور احمد، پروفیسر اسماعیل کے پونا والا، پروفیسر الفورڈ ٹی ولیش۔

انگلستان: پروفیسر آر۔ بی سرجنٹ سابق پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی، ڈاکٹر کے۔ کریگ، پروفیسر منٹگمری واٹ، ڈاکٹر یعقوب ذکی بنگلہ دیش، ڈاکٹر مستفیض الرحمٰن ڈھاکہ، ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، راج شاہی پروفیسر امام الدین ڈھاکہ۔

پاکستان: اے۔ کے بروہی، وزیر حکومت پاکستان، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر عبد الواحد ہالی پوتا اسلام آباد، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن پشاور، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ۔

ترکی: ڈاکٹر ایل السین، ڈاکٹر اکمال الدین احسان اوگلو۔

جاکرتا: ڈاکٹر چوہان آفندی۔

جنوبی افریقہ: ڈاکٹر جی۔ ایم کریم۔

حجاز: ڈاکٹر حسن باجوہ

لیڈن: پروفیسر بالی اون۔

کینیڈا: پروفیسر خالد بن سعید، کنگسٹن۔

ہندوستان: پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ، پروفیسر شبیر الحق جامعہ ملیہ، ڈاکٹر آزاد فاروقی جامعہ ملیہ۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی علی گڑھ، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، ڈاکٹر امجد علی، ڈاکٹر اکمل ایوبی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی، ڈاکٹر عبد الباری مسلم یونیورسٹی، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین اعظم گڈھ) پروفیسر سید وحید الدین، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی۔ ڈاکٹر کرسچین ٹرول، نئی دہلی۔ مولانا شاہین جمالی دیوبند، ڈاکٹر ادریس حیدرآباد، ڈاکٹر عبد العلی بھوپال، پروفیسر نیرحسن عابدی، بنارس یونیورسٹی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، پال جیکسن پٹنہ، ڈاکٹر محمد صابر خان کلکتہ مولانا فضل الرحمٰن ہلال عثمانی، مالیر کوٹلہ۔ مولوی محمد اسلم اصلاحی، سری نگر کشمیر۔

شروع میں یہ بات کھٹکی کہ جو قرآن پاک کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے ہیں، وہ اس اجتماع میں کیوں مدعو کیے گئے، مگر معلوم ہوا کہ اس کانگریس کی تاسیس آسٹریلیا کے ایک عیسائی مسٹر جون نے کی ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ اس میں ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر خیال کے اہل علم جمع ہو کر قرآن پاک کو اپنے اپنے زاویۂ نظر سے سمجھیں اور سمجھائیں، اس لحاظ سے یہ مسلمان علماء اور فضلاء کی کانگریس نہ تھی بلکہ عام علمی اجتماعات کی طرح

یہ بھی ایک اجتماع تھا۔ اس میں مسلمانوں میں ان کو بھی مدعو کیا گیا ہے جو بنیاد پرست، قدیم الخیال، اور جدید الفکر سمجھے جاتے ہیں، اس طرح یہ کانگریس ایسا محاذ ہے، جہاں ہر قسم کی معرکہ آرائی ہو سکتی ہے، ایسے محاذ پر صحیح العقیدہ علمار کا پہونچنا ضروری ہے، ان کے لیے اس کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں، ایسے اجتماع میں نظر و فکر کی گہرائی سے زیادہ قوت گویائی زیادہ مفید ہوتی ہے، حاضرین و سامعین کی مزاجی اور نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھ کر جو بھی رطب اللسان ہو جائے، مجلس اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو مسلمان اپنے کو موڈرنسٹ سمجھتے ہیں ان کی نجی گفتگو یہی تھی کہ اسلام میں پردہ، موجودہ بینک کے نظام اور موسیقی سے متعلق کیا قرآنی احکام ہیں؟ جاکرتا کے ایک مسلمان نمایندہ نے اپنے مقالہ میں یہ پڑھا کہ ہم جب پندرہویں صدی ہجری میں رہتے ہیں تو پہلی صدی ہجری میں رہنا پسند نہیں کریں گے، مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں، جہاں وہ رہتے ہیں، وہاں ان کا تاریخی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور عمرانی پس منظر ہے، جس سے وہ علیٰحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتے، ہر قسم کے علوم کی ترقی سے دنیا کی سرزمین سمٹ گئی ہے، اور اس میں جو ترقی ہو رہی ہے اس سے منھ موڑ کر مسلمان زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتے، اگر اسلام ہر زمانہ کے لیے ہے، آج کے لیے بھی ہے اور کل کیلیے بھی ہے تو بتایا جائے کہ ہمارا مذہب ہماری تغیر پذیر زندگی کا ساتھ کس طرح دے، جو موڈرنسٹ تھے انھوں نے اس مقالہ کی بڑی داد دی، حالانکہ کچھ مقالے ایسے بھی تھے جن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ قرآن پاک میں یہ لیے ہوئے حالات کے مطابق مسائل کو حل کرنے کے لیے ساری ہدایتیں ہیں، اس کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں پاکستان کے اے۔ کے بروہی صاحب نے اپنے کلیدی خطبہ میں بہت ہی موثر انداز میں یہی بات پیش کی کہ اگر ہر کام اللہ تعالیٰ کو سامنے رکھ کر کیا جائے اور یہ ذہن نشین ہو جائے کہ کائنات، یہ دنیا، یہ دن، یہ رات اللہ تعالیٰ کی ہے اور کلام اللہ میں ساری باتیں ہیں جن کی تلاش ہر زمانہ میں ہوتی ہے تو پھر آج یا کل کا دور ہو، اس میں ذہن بگڑنے نہیں پاتا، اگر اللہ پر ایمان ہو تو ہر غیر واضح چیز

واضح ہو کر نظر آتی ہے، جناب بروہی صاحب جب اپنے خطبہ میں اپنی خطابت اور ایمان پروری کی گل پاشی کرنے والے تھے تو مغرب کی نماز کے لیے یہ افتتاحی اجلاس ختم کر دیا گیا، جس سے سامعین کی پوری تشنگی بجھ نہ سکی، مگر ان کی ناتمام تقریر پورے کانگریس کی جان تھی، اور جنھوں نے اس کو سنا وہ اپنے فردوس گوش میں اب تک لطف و لذت کے ساتھ آباد ہوں گے۔

اس کانگریس میں عیسائی مندوبین کافی تعداد میں تھے، ان میں کچھ پادریوں کے فرزندان ارجمند بھی تھے، ایسے ملے جلے اجتماع میں یہ لوگ ذرا مصلحت کوش بن جاتے ہیں، اور ان کی زہر چکانی کھل کر سامنے نہیں آتی، ذرا دبے دبے رہتے ہیں، اسی اجتماع میں ایک صاحب نے بتایا کہ اب تو عیسائیوں کو ان کے پوپ کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اسلام پر جارحانہ حملہ نہ کیا کریں، ایک اور صاحب نے بتایا کہ سری لنکا میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو ڈائیلاگ ہوا تو وہاں کے عیسائیوں نے کلام پاک کو ایک الہامی کتاب تسلیم کر لیا ہے، اس اجتماع میں ودیا جیوتی انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے فادر کرسچین ڈبلیو۔ ٹرول سے ملاقات ہوئی جو مسلمانوں کے علمی حلقوں میں اچھی طرح روشناس ہیں، بڑی میٹھی گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے اپنی طرف سے کئی کتابیں نذر کیں، جن میں ایک گائڈ لائنز فور ڈائیلاگ بٹوین مسلم اینڈ کرسچینز بھی تھی، اس کو شوق سے پڑھا، اس کی تمہید کا خلاصہ یہ ہے:

"دنیا میں خیالات، کلچر اور مذاہب کے تنوعات ہیں، ان میں اضافہ ہوتا رہے گا، آیندہ ان کے ختم ہونے کی امید نہیں، یہ ممکن نہیں کہ ہم ان کے پیرووں اور مقلدوں کو قائل کر کے ان کو اپنا ہم خیال اور ہم مذہب بنائیں لیکن ضرورت اب اس کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں اور سمجھ کر جہاں تک ممکن ہو اتفاق کر کے ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں تاکہ دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بن جائے، اسی لیے اس کتاب میں اس کی تلقین ہے کہ عیسائی اسلام کو اپنے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ نہ کریں، بلکہ مسلمان اسلام کو کیا سمجھتے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، پھر اس میں عیسائیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اسلام کو ایک مذہب

سمجھیں اور اسلام میں قرآن کی جو اہمیت ہے اس کو کسی لحاظ سے نظرانداز نہ کریں، کیونکہ فرانس کے موسیئون
نے بھی کہا ہے کہ مسیح کی ذات عیسائیت کا مرکز ہے، لیکن اسلام کا مرکز ایک کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے۔
مسلمان قرآن کو کلام الٰہی سمجھتے ہیں، ہر پرہیزگار مسلمان اس سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے، جس مسلمان کے
دل میں کچھ شکوک بھی ہوتے ہیں، وہ بھی اس کا بڑا احترام کرتا ہے، مسلمان اس وقت مشتعل ہو جاتے ہیں جب
مغرب کا کوئی دانشور یہ کہتا ہے کہ قرآن میں محمدؐ نے یہ کہا، مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، محمدؐ
اس کے مصنف نہیں ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن محمدؐ پر نازل ہوا، موسیئون نے بھی کہا ہے کہ یہ آسمان سے
لکھوایا گیا، اسی لیے جب مسلمان کسی آیت کا حوالہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے، وہ اس کی
امید تو نہیں کرتے کہ عیسائی بھی یہی کہہ کر آیت کا حوالہ دیں، مگر عیسائیوں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ یہ کہیں
کہ قرآن کہتا ہے"۔

اس کتاب میں اسی طرح کی اور ہدایتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا جارحانہ اور غیر رواداری
رویہ بدل رہا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس بدلے ہوئے رویہ میں ان کا جو اصل مقصد ہے، وہ بھی نظرانداز
نہیں کیا جا سکتا، وہ افہام وتفہیم کو بھی اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنا سکتے ہیں، جس سے بہرحال چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

افہام وتفہیم کے ذریعہ سے اسلام کو سمجھنے والے ابھی عیسائی اسکالرز کم ہیں، ان میں ایسے اہل قلم
اب بھی ہیں جو قرآن کانگریس کے جیسے لے جلے مجمع کو اپنے خیالات کی ترویج کے لیے غنیمت سمجھتے ہیں،
مثلاً اس اجتماع میں امریکہ کی مچیگن یونیورسٹی کے پروفیسر الفورڈ ٹی ویلش نے جو مقالہ پڑھا، اس میں یہ ظاہر
کرنے کی کوشش کی:

"قرآن مسلمانوں کے دل و دماغ پر ضرور چھایا ہوا ہے، لیکن مغرب میں دنیا کے اس عظیم علمی کام کو اب تک
بہت ہی کم سمجھا گیا ہے، مغرب کے عام لوگ اس سے ناواقف ہیں، اس کے علاوہ اس کے ناقدانہ مطالعہ
سے اب تک بعض بنیادی سوالات کے جوابات نہیں ملے ہیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی اور اس کی اصلی تاریخ

کیا ہے؟ آج سے پچیس[25] سال پہلے پروفیسر آرتھر جیفری کا ایک اہم مضمون "قرآن کے مطالعہ کی موجودہ
حیثیت" کے عنوان سے واشنگٹن کے ایک رسالہ رپورٹ اون دی کرنٹ ریسرچ ان دی مڈل ایسٹ
میں شایع ہوا تھا، اس ربع صدی میں اس پر شک کیا جا رہا ہے کہ کیا قرآن کا موجودہ نسخہ مستند ہے؟
اس کی تدوین کس طرح ہوئی؟ اس کے مختلف پارے کس طریقہ سے ترتیب دیے گئے، محمدؐ نے اور آپ کے
بعد کس نے کس حد تک اس کو ایڈیٹ کیا، اس کے اندر جو تضاد ہے اس کی کیا اہمیت ہے؟ جیفری نے اس کا
ایک ناقدانہ نسخہ اسی طرح مرتب کرنے کی کوشش کی جس طرح انجیل اور دوسری مقدس کتابوں کا ہوا،
لیکن ان کی موت کے بعد یہ کام بالکل رک گیا، اور بہت سے دانشوروں کا خیال ہے کہ ایسا کام کرنا
ناممکن ہے"۔

اسی کے ساتھ اس مقالہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ کچھ دانشور ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی تدوین
صدیوں ہوتی رہی اور یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہو سکی ہے کہ محمدؐ ہی نے اس کی تاریخی ترتیب دی، ضرورت
اس بات کی ہے کہ بین الاقوامی تعاون سے ان سوالات کے جوابات دیے جائیں، جو اب تک نہیں
دیے جا سکے ہیں۔

مقالہ نگار نے کوئی نئی بات نہیں کی، ایسا لٹریچر بھرا پڑا ہے جس میں قرآن کی صحت، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی ترتیب اور تدوین سے متعلق پوری وضاحت کر دی گئی ہے، بات یہ ہے
کہ موجودہ انجیل کے مستند ہونے اور نہ ہونے پر برابر بحثیں جاری ہیں، جس سے عیسائیوں کا عام ذہن کافی
شکوک اور مشتبہ ہو چکا ہے، اب سے پہلے عیسائی مبلغوں نے انجیل کی مدافعت میں قرآن پاک کے متعلق
اس قسم کی بحثیں اٹھائی تھیں، اب یہ بحث علمی اور تحقیقی محاذ پر قصداً منتقل کر دی گئی ہے، لیکن اسی اجتماع
میں اس کا جواب کیمبرج یونیورسٹی کے ایک سابق پروفیسر آر. بی. سرجنٹ کے مقالہ کے بعض جملوں سے
مل جاتا ہے کہ

مغرب کے اسکالرز جو مسلمان نہیں ہیں، فطری طور پر ایک مختلف انداز سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، اب ان کے مطالعہ میں معروضیت آرہی ہے، اس لیے اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ اکثر ہمدردانہ ہوتا جارہا ہے، لیکن استثنائی مثالیں ایسی بھی ہیں جو تعصب کی نظر سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن اس میں غیر فاضلانہ رنگ ہوتا ہے۔"

اور یہی بات قرآن کے تمام معترضوں اور ناقدوں کے لیے کہی جاسکتی ہے، پروفیسر ویلش نے جب مقالہ ختم کیا تو اس خاکسار نے اٹھ کر سوال کیا کہ ان کو قرآن پاک کے ایک کریٹیکل ٹکسٹ کی تلاش کیوں ہے؟ کیا یہ تلاش اس کے کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے ہے، یا وہ محض اس کو ایک علمی شاہکار سمجھتے ہیں؟ ان کا ماہرانہ جواب یہ تھا کہ قرآن پاک کلام الٰہی یا علمی شاہکار سمجھا جائے، دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایسے اجتماع میں ایسے ہی جوابات سے لوگوں کو مطمئن کرلیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہیں رہا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قلمبند نہ کرلیا گیا ہو، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کرایا وہ تحریری نوشتوں سے مرتب ہوا تھا، جس کی تصدیق ان لوگوں سے بھی کرائی گئی جو قرآن مجید کے کلاً یا جزاً حافظ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام سورتیں مرتب ہو چکی تھیں اور ان کے الگ الگ نام قائم ہو چکے تھے، جو نسخے ایسے تھے جن میں کاتبوں کی غلطی سے کچھ تغیر ہوگیا تھا، حضرت عثمانؓ نے ان سب کو جلوا دیا، اور جو قرآن مجید اس وقت مسلمان پڑھتے ہیں ان ہی پر ان کا ایمان کامل ہے، اگر ہمارے عیسائی فضلاء اس کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو پھر انھوں نے اگر بین الاقوامی تعاون سے اپنے نقد و نظر سے کوئی نسخہ مرتب کیا تو وہ مسلمانوں کے لیے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا، عیسائی اپنے تفکر اور تدبر سے انجیل کے چاہے جتنے بھی نئے نئے نسخے مرتب کرنا چاہیں کرتے رہیں مگر انھوں نے کلام پاک کا کوئی نیا نسخہ مسلمانوں یا غیر مسلمانوں کے لیے تیار کیا تو یہ مسلمانوں کے جذبات کو صرف

مشتعل کرنا ہوگا۔

اسی اجتماع میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر بدرالحسن عابدی نے ایک مقالہ پڑھا جس میں یہ واضح کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں حضرت علیؓ کے ذریعہ سے پورا قرآن مرتب کرادیا تھا، اور آج کل جو قرآن ہم پڑھتے ہیں وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا، اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی، حضرت عثمانؓ پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ انھوں نے اس میں تحریف کی، ان کے عہد میں ان پر بہت سے الزامات عائد کیے گئے، لیکن یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ انھوں نے قرآن مجید میں تحریف کی، حضرت علیؓ کو بھی ان سے اختلاف رہا، لیکن اس اختلاف میں انھوں نے حضرت عثمانؓ پر قرآن مجید کی تحریف کا الزام نہیں رکھا، پروفیسر عابدی نے پرزور طریقہ پر یہ ثابت کیا کہ قرآن میں نہ اب تک کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ آیندہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں"، (سورۃ الحجر، رکوع ۱) پروفیسر عابدی نے بڑی محنت سے یہ مقالہ لکھا تھا، خاکسار نے اس پر ان کو داد اور مبارکباد دی، انھوں نے تمام شیعوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرکے ان سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کردیں۔

اس اجتماع میں خاکسار کے مرکز توجہ منٹگمری واٹ تھے جو اڈنبرا یونیورسٹی میں استاد ہیں، انھوں نے محمد ایٹ مکہ، محمد ایٹ مدینہ، محمد دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کرلی ہے، راقم آج کل ان ہی کی کتابوں پر ایک طویل تبصرہ لکھ رہا ہے جو ممکن ہے کہ ایک پوری جلد میں ختم ہو، ان کی کتابوں کا ہر صفحہ ان کے پُرفریب استدلالات اور مغالطوں سے پُر ہے، انھوں نے اپنی ان کتابوں میں دعویٰ کیا ہے کہ محمدؐ کی سوانح عمری اب تک مورخانہ انداز میں نہیں لکھی گئی، اس لیے وہ آپؐ کے حالات کا تجزیہ مورخانہ انداز میں کریں گے، جب یہ خاکسار تغلق آباد پہونچا تو مہمان خانہ کے ایک کمرہ میں پاکستان کے لائق اور قابل وزیر جناب اے۔ کے بروہی صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے سابق استاد مسٹر آربی سرجنٹ سے باتیں کررہے تھے، جناب بروہی صاحب نے

میرا تعارف ان سے کرایا، اس کے بعد بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، منٹگمری واٹ کا بھی
ذکر آگیا، خاکسار نے عرض کیا کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ انھوں نے محمدؐ کی زندگی کا مطالعہ ایک
مورخ کی حیثیت سے کیا ہے، مسٹر سرجنٹ نے کہا کہ ہمارے حلقہ میں وہ مورخ کی حیثیت سے تسلیم نہیں
کیے جاتے، اسی لیے کیمبرج ہسٹری کی تدوین کے سلسلہ میں ان سے کوئی مضمون طلب نہیں کیا گیا، وہ مورخ
ہو بھی نہیں سکتے، اس لیے کہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے یہاں
یقینیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بے جا معلولات کو زیادہ دخل ہے،
ان کی تحریروں میں غالباً 'اندازہ کیا جاسکتا ہے' 'رہا ہوگا' 'ہوا ہوگا' 'شاید' 'خیال ہے' 'احتمال ہے'
وغیرہ جیسے الفاظ اور فقروں کو جمع کر دیا جائے تو معلوم نہیں ان کے جمع کرنے میں کتنے اوراق کی ضرورت
ہو، وہ اپنی تحریروں میں ثانوی درجہ کے ماخذوں سے زیادہ مدد لیتے ہیں، اور انہی ماخذوں پر بھروسہ
کرتے ہیں جو ان کے مطلب کے ہوتے ہیں، قرآن کی آیتوں کے بھی حوالے دیتے ہیں، مگر انگریزی ترجمے
کا سہارا لیتے ہیں، اور ایسے ہی ترجمے نقل کرتے ہیں جو مسخ اور غلط ہونے کی وجہ سے ان کی خاص
مطلب برآری میں مفید ہوتے ہیں، پھر قرآن کو اپنا ماخذ بنانے میں یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں کہ اس میں
تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں، خوب!
اس کا مطالعہ گویا ڈاکٹریٹ کے ایک مقالہ کی حیثیت سے کرنے کی ضرورت تھی، انھوں نے اپنے
پُرفریب طریقہ سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کلام پاک کلام الٰہی نہیں، نہ یہ الہامی ہے اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی رہی، کلام پاک کے ان انگریزی ترجموں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن میں
وحی کا ترجمہ Revelation کیا گیا ہے، اس لیے وحی کے سلسلہ میں Dream،

Divine eruption , True vision , Vision ,

Intellectual locution Exterior locution

Intuition of creative imagination اور

وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجلک بحث کر کے اپنے ناظرین کے ذہن کو بھی گنجلک بنانے کی کوشش کی ہے،
مورخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو یہ تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمدؐ کے پیرووں کا خیال ہے کہ
قرآن مجید کلام الٰہی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمدؐ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے،
بات یہاں پر ختم ہو جاتی، پھر ان کو اسلام کا مورخانہ، ناقدانہ اور دانشمندانہ مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کا
پشتارہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

میرا ان سے تعارف ہوا تو عرض کیا کہ ان کی کتابیں میرے مطالعہ میں آئی ہیں اور ان پر میں بہت ہی
مخالفانہ تنقیدیں لکھ رہا ہوں، ان کا بڑا ٹھنڈا جواب یہ تھا کہ وہ ان تنقیدوں کو پڑھ کر خوش ہوں گے،
اس اجتماع میں وہ زیادہ تر خاموش رہے، یہاں وہ اپنی تصانیف کو شاید پیچھے چھوڑ کر آئے تھے،
ان کے مقالہ کا عنوان "قرآن میں مسلم اور عیسائی کے تعلقات" تھا، اس میں انھوں نے بتایا کہ قرآن
میں ان تعلقات کے پانچ پہلو ہیں: (۱) عیسائی مسلمانوں کے دوست سمجھے گئے، یہ زیادہ تر مکی اور
مدینہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں ہے، (۲) حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا ذکر ہے (۳) یہودیوں نے
حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو جس طرح رد کیا ہے اس کا بیان ہے (۴) تثلیث پر تنقیدیں ہیں (۵) محمدؐ کی
آخری زندگی میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بنائیں بلکہ ان سے
جنگ کریں، یہ ہدایت موتہ کی جنگ کے بعد ہوئی جس میں زید بن حارثہؓ شہید ہوئے۔

اس اجتماع میں امریکہ کے [illegible] بی اروِنگ اپنی اہلیہ کے ساتھ نمایاں ہو کر ہر شخص سے بے تکلفی سے
ملتے رہے، انھوں نے اسلام قبول کر کے کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، اپنے مقالہ میں اس پر
زور دیا کہ قرآن پاک کے جو ترجمے مسلمانوں نے انگریزی میں کیے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک
پہونچایا جائے، تاکہ غیر مسلموں نے اپنے تعصب میں اس کے ترجمے میں جو زہر چکانی کی ہے، اس کا اثر

دور ہو، خاکسار نے ان سے ایک ملاقات میں یہ عرض کیا کہ وہ ایسے اجتماع میں عیسائی مقالہ نگاروں کے ذہن کو اچھی طرح سمجھ کر ان ہی کے انداز میں ان سے بحث کر کے ان کو خاموش کر سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، امریکہ میں عیسائیوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام اب ختم ہو چکا ہے، مگر وہاں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جس کا یہ خیال ہے کہ جو قرآن کو کلام الٰہی نہیں سمجھتا ہے وہ کافر ہے، اب ان دونوں گروہوں میں جو اختلاف ہے اس سے خود بخود ایک ایسی نئی صورت پیدا ہوگی جس سے اسلام کو فائدہ پہونچے گا۔

اس اجتماع میں کافی مقالات پڑھے گئے، ان کی تعداد غالباً ترسٹھ تھی، زیادہ تر اچھے مقالات تھے، کینیڈا کی کوئن یونیورسٹی کے پروفیسر خالد بن سعید نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنا مقالہ "قرآن میں سماجی انصاف کے تخیل" کے عنوان سے پڑھا، اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ قرآن میں توحید کے بعد سماجی انصاف ہی کی اہمیت ہے، ایران اور سعودی عرب میں سماجی انصاف کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بھی تفصیل بتائی، گجرات یونیورسٹی کے پروفیسر جے. آئی. لالی والا نے اپنا مقالہ پڑھنے کے بجائے خطیبانہ انداز میں یہ بتایا کہ شرکت اور مضاربت کے اصول پر سود سے پاک بینک کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے، ان کی رائے تھی کہ بینک میں روپیہ جمع کرنے والا بینک کا پارٹنر ہو جاتا ہے اور بینک کے منافع میں اس کا حق ہوتا ہے، بینک اگر کسی کو قرض دیتا ہے تو قرض لینے والا بینک کا پارٹنر نہیں ہوتا ہے بلکہ بینک اس کا پارٹنر ہو جاتا ہے لیکن اس کی تجارت کا پارٹنر نہیں ہوتا اس لیے بینک اس کی تجارت کے منافع میں تو شریک ہو سکتا ہے لیکن اس کے خسارہ میں شریک نہیں ہو سکتا، وقت کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ پھیلا کر نہیں پیش کر سکے، مگر ان سے بینک کے منافع، یوژیری، انٹرسٹ، اور سود سے متعلق قرآنی احکام کے متعلق کافی سوالات کیے گئے۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر سید وحید الدین نے اپنے پر مغز مقالہ میں

فلسفیانہ انداز میں یہ پیش کیا کہ قرآن بدلتے ہوئے حالات اور بدلتی ہوئی دنیا میں پورا ساتھ دے سکتا ہے، بشرطیکہ انسان اس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا مقالہ "قرآن میں امن پسندی اور اس کے مسائل کا حل" کے عنوان سے تھا، وہ اردو میں اپنے خیالات کے موتی بکھیرتے رہتے ہیں، انگریزی میں بھی یہ مقالہ لکھ کر اس زبان پر اپنی مہارت کا ثبوت دیا، دویا جیوتی انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کرسچین ٹرول نے اپنا مقالہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ کی تفسیر ثنائی پر جب پڑھا تو سامعین کو حیرت تھی کہ یہ کوئی عیسائی یا کوئی مسلمان مقالہ نگار پڑھ رہا ہے، پٹنہ کے پول جیکسن نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا تصوف خالص قرآنی تعلیمات پر مبنی تھا، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اسلامی قوانین کے شعبہ کے صدر ڈاکٹر طاہر محمود نے مقالہ پڑھنے کے بجائے ایک دل نشین تقریر کی اور اپنی خطابت کی پوری شان دکھاتے ہوئے بتایا کہ کلام پاک کے بظاہر تضاد میں اخلاقی، معاشرتی اور فقہی قوانین کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے تفسیری رموز و نکات کی وضاحت کی، مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر امجد علی کے مقالہ کا عنوان "توحید کے اثرات مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر" تھا، کشمیر یونیورسٹی کے مولوی محمد اسلم اصلاحی نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تصانیف پر بڑا اچھا تبصرہ کیا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے ڈاکٹر محمد اکمل ایوبی نے ترکی زبان میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان پر روشنی ڈالی، اسی شعبہ کے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی نے توحید اور معاد پر اپنا مقالہ پڑھا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے ڈاکٹر عبدالباری کا مقالہ "بیسویں صدی میں قرآن کی اخلاقی تعلیمات کی اہمیت" کے عنوان سے تھا، دیوبند کے مولانا شاہین جمالی کا مقالہ بھی توحید پر تھا، جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر مشیر الحق اپنی مقالہ خوانی سے سامعین کو اپنی طرف پورے طور سے متوجہ کر لیتے ہیں، اس اجتماع میں ان کے مقالہ کا یہ موضوع تھا کہ الٰہیات کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے، قرآن پاک میں بعض الفاظ اور مطالب

ایسے ہیں جن کے ترجمے دوسری زبانوں میں صحیح طور پر نہیں ہو سکتے، اس لیے اس کے معانی اور مطالب بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی تو سیمنار کے مرد میدان ہیں ان کے مقالہ کا موضوع "اسمائے حسنیٰ" تھا، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر آزاد فاروقی کا مقالہ "قرآن میں آفاقیت اور تخصیصیت ......" کے عنوان سے تھا، کلکتہ کے ڈاکٹر محمد صابر خان ہر مقالہ نگار سے کچھ نہ کچھ سوالات کرنے میں پیش پیش رہے، ان کے مقالہ کا موضوع "معاشرت میں انسان کی حیثیت کا قرآنی تخیل تھا، بھوپال کے حمیدیہ کالج کے ڈاکٹر عبدالعلی کا مقالہ "پُرامن بقائے باہمی سے متعلق قرآنی احکام" کے عنوان سے تھا۔

ترکی سے دو نمایندے تھے، ایک تو بوڑھی خاتون ڈاکٹر ایکل امین تھیں، جنھوں نے "قرآن اور اسلامک آرٹ" پر اپنا مقالہ پڑھا، دوسرے اکمال الدین احسان اوگلو تھے، جنھوں نے مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمے کی ابتدائی کوششوں پر اپنے مقالہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، کچھ سامعین نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ ترکی کے ترجمہ میں عربی متن بھی ضرور دیا جائے۔

پاکستان کے نمایندوں میں ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد اپنی باوقار سفید داڑھی اور جاذب نظر شخصیت کی وجہ سے نمایاں رہے، وہ شاہ ولی اللہؒ کے بڑے شیدائی اور فدائی ہیں، کسی مقالہ میں شاہ ولی اللہؒ کا ذرا بھی نام آیا، ان کا ذہن بیدار ہو جاتا، ان کے مقالہ کا موضوع "موجودہ حالات کے مطابق سندھی علماء کی قرآنی تفسیریں" تھا، پشاور سے ڈاکٹر مجیب الرحمن آئے، جن کو دیکھ کر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریۂ ہند) کی جوانی یاد آجاتی ہے، یہ خاکسار جب ان سے ملتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ ذاکر صاحب مرحوم اپنی جوانی میں آپ ہی کے ہم شکل تھے، ان کے قد رعنا، گورے رنگ اور خوبصورت سیاہ داڑھی کی وجہ سے ہر شخص کی نظر ان کی طرف اٹھتی، ان کا مقالہ "قرآن میں توحید اور اخوت" پر تھا۔

کوئٹہ کے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مقالہ کا عنوان تو قرآن اینڈ سسٹم آف ریلوز تھا، لیکن ان کے مقالہ کی یہ بات بڑی معنی خیز تھی کہ موجودہ دور میں ان لوگوں کے لیے جن کو موجودہ علوم پر پورا عبور حاصل ہے قرآن پاک میں وہ ساری باتیں مل جائیں گی جن کی تلاش آج کل ہے، اور ان مشکلات کا حل بھی مل جائے گا جن سے وہ موجودہ زمانہ میں دوچار ہیں، پروفیسر منظور احمد آج کل کو لمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، مگر پاکستانی ہیں، انگریزی بہت اچھی اور دل کش لہجے میں بولتے ہیں، اچھے مقرر بھی ہیں، جو بات کہتے ہیں اس کو اپنے خاص خطیبانہ انداز سے موثر بنا دیتے ہیں، ان کا مقالہ مذہبی زبان کی نوعیت پر تھا، جس کے تحت سرسید احمد خان کی تفسیر پر روشنی ڈالی۔

بنگلہ دیش سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر مستفیض الرحمن اور راج شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن آئے تھے، اول الذکر کے مقالہ کا عنوان "قرآن اور پندرہویں صدی ہجری کا چیلنج" تھا، موخر الذکر نے "قرآن کے بنگالی ترجمہ پر روشنی ڈالی، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر امام الدین بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، بین الاقوامی سیمناروں میں ضرور بلائے جاتے ہیں، انھوں نے اپنا مقالہ "قرآن میں ماضی اور حال کی جھلکیں" کے عنوان سے پڑھا۔

خاکسار نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا تھا کہ علامہ محمد اقبالؒ نے قرآن پاک کو کس طرح سمجھا، اور لوگوں کو کس طرح سمجھانے کی کوشش کی، خاکسار کو علامہ محمد اقبالؒ سے عشق ہے، اس لیے جب وہ ان کے کسی خیال کو پیش کرتا ہے تو جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، اس مجمع میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

تو مجھے خود ایسا محسوس ہوا کہ میں اس مجمع کے لیے ملہم غیب کی آواز دہرا رہا ہوں۔

اور جب یہ پڑھا کہ اقبال نے وارڈ، برگساں، میک ٹگارٹ، ولیم جیمس سب ہی کا مطالعہ کیا لیکن ان کو ان فلسفیوں کے یہاں کچھ بھی نہیں ملا، انھوں نے سورۂ اخلاص کا مطالعہ چشم بینا اور

قلب مصفا سے کیا تو اس میں ان کو زندگی کی ساری تابانی مل گئی، انھوں نے اس میں خودی کا بیش بہا خزانہ بھی پایا، جہاں سے خودی کی دولت انسانوں میں تقسیم کی گئی، اور جب اس مقالہ میں یہ دکھایا کہ اقبال نے قرآن پاک کی آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے سینۂ کائنات میں انسان خود خدا کا ہمراز ہے، اور خود خدا نے کائنات کو برقرار رکھنے میں انسان کو اپنا شریک کار بنالیا ہے، تو ایسا معلوم ہوا کہ اس مقالہ میں کوئی نئی بات کہی جارہی ہے، سورۂ اخلاص میں جو توحید کا درس ہے اس میں اقبال کے خیال میں انسانیت کی یکجہتی کا بھی پیام ہے، جس کے ذریعہ سے ایک لازوال انسانی تمدن بروئے کار آسکتا ہے، اقبال کے خیال میں قرآن میں اطاعت خداوندی کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ انسان خود اپنی فطرت کی اطاعت کرے، اقبال کو زمان و مکان کا نظریہ بھی قرآن پاک ہی میں ملا، اقبال نے یہ بھی بتایا کہ سائنس دانوں کو اپنے جن نظری اور فکری ارتقاء پر ناز ہے، قرآن پاک میں بہت پہلے ان کے منہاج طے کر دیے گئے ہیں، اسی قسم کی اور باتیں تھیں، جب یہ مقالہ ختم ہوا تو جناب حکیم سعید نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ کرکے میرے پاس جلد از جلد بھجوائیں، اس سے ایک خاص کام لوں گا، پاکستان کے نمایندوں نے کہا کہ اقبال کا جو پیام پاکستان کی طرف سے آنا چاہیے تھا، وہ ایک ہندوستانی نے اس مجمع کو پہونچا دیا، کینیڈا کے پروفیسر خالد بن سعید نے مل کر کہا: مقالہ بڑا زوردار تھا، خاکسار نے عرض کیا: مقالہ زوردار نہیں تھا، اقبال کے خیالات زوردار تھے، وہی داد کے مستحق ہیں، پشاور کے ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ جس جذبہ سے یہ مقالہ لکھا اور پڑھا گیا، وہ بہرحال قابل داد ہے۔

میرے رفیق کار مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے "قرآن میں توحید کی دلیلیں" پر اپنا مقالہ اچھے انداز میں پڑھا جو پسند کیا گیا، بیرونی مہمانوں کیلئے اس کا خلاصہ جناب اطہر حسین صاحب آئی. اے. ایس نے انگریزی میں سنایا جب انسٹی ٹیوٹ کے جناب اوحد علی کی گاڑی پر رخصت ہوا تو دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ اللہ اس انسٹی ٹیوٹ کو صحیح معنوں میں بیت الحکمت بنا دے۔

ادبیات

نعت شریف

از

جناب وارث ریاضی صاحب چمپارن

اے نو بہارِ گلشنِ یزداں تجھے سلام
اے روحِ عصر و ہادیِ دوراں تجھے سلام

اے فخرِ کائنات و شہنشاہِ انس و جاں
اے صدرِ بزمِ عالمِ امکاں تجھے سلام

اے رفرف آشنائے ہدایت، امامِ کل
اے منبعِ تجلّیِ عرفاں تجھے سلام

اے کاشفِ رموزِ جہاں، نازشِ وجود
اے رازدارِ محفلِ یزداں تجھے سلام

تجھ سے گلوں کا رنگ، چمن کا ہے تجھ سے حسن
اے آبروئے جشنِ بہاراں تجھے سلام

تیرے کرم سے دولتِ ایماں ہمیں ملی
اے قاسمِ خزینۂ ایماں تجھے سلام

اے صادق و بشیر، رؤف و رحیم بھی
اے غمگسار و محسنِ انساں تجھے سلام

اے بانیِ ایثار و وفا، مرجعِ خلوص
جود و سخا کے مہرِ درخشاں تجھے سلام

قدموں پہ تیرے کفر کا پرچم ہے سرنگوں
اے ماحیِ ضلالت و عصیاں تجھے سلام

تیرے ہی ذکر سے دل کو ملا سکوں
رنج و غمِ حیات کے درماں تجھے سلام

وارث کو تیرے موجِ حوادث کی فکر کیا
اے ناخدائے کشتیِ انساں تجھے سلام

نعت شریف

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

تمنا ہے کہ مل جائے سہارا مصطفائی کا
وسیلہ چاہتا ہوں باغِ جنت تک رسائی کا

اسیرِ کوچۂ سرور اگر اک بار ہو جاؤں
نہ لوں پھر زندگی بھر نام طیبہ سے رہائی کا

خموش اے دل حریمِ قدس میں لغزش نہ ہو جائے
ادب کی جا ہے یہ موقع نہیں ہے لب کشائی کا

حیات اس کی، ممات اس کی، یہ ساری کائنات اس کی
شرف ہو جائے حاصل جس کو طیبہ تک رسائی کا

میں ہندو ہوں مگر ایمان رکھتا ہوں محمدؐ پر
کوئی انداز تو دیکھے مری کافر ادائی کا

ڈبوئے گی بھلا کیا موجِ طوفاں اس سفینے کو
سہارا مل گیا جس کو نبیؐ کی ناخدائی کا

ادھر آئیں کہاں ہیں حسنِ طیبہ دیکھنے والے
مری آنکھوں سے دیکھیں جلوہ شانِ مصطفائی کا

شہنشاہانِ عالم سے ہے اس کا مرتبہ اونچا
شرف حاصل ہے جس کو آپؐ کے در کی گدائی کا

زہے قسمت ملی ہے خاکِ پائے مصطفےٰؐ مجھ کو
یہی حاصل ہے جوہرؔ زندگی بھر کی کمائی کا

مطبوعات جدیدہ

حسنات الحرمین ۔ مرتبہ و مترجمہ، جناب محمد اقبال مجددی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۸، مجلد قیمت ۳۲ روپیے، پتہ (۱) راجہ برادرز بک سیلر رحیم بازار، ڈیرہ اسماعیل خان پاکستان، (۲) میاں احمد، معرفت قاری شاہ نواز، مسجد سیدان والی، پاکستانی چوک اچھرہ، لاہور،

حضرت خواجہ محمد معصومؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزند و جانشین اور خود بھی جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، دعوت و ارشاد کی خدمت میں مشغول رہنے کی بنا پر انھیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا تاہم ان کے مکتوبات کی تین جلدیں اور بعض رسائل طالبین سلوک کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں، زیر نظر رسالہ حضرت خواجہ کے سفر حج کی یادگار اور ان مکاشفات اور احوال، فرمودات اور ملفوظات کا مجموعہ ہے، جو حضرت کے آغاز سفر، قیام حجاز اور ہندوستان کی واپسی کے دوران میں انھوں نے بیان کئے تھے، حضرت خواجہ کے ہمراہ اس مبارک سفر میں ان کے صاحبزادگان، اعزہ، متوسلین اور خلفاء و مریدین کی بڑی تعداد تھی، زیر نظر رسالہ کے جامع و مرتب آپ کے فرزند حضرت محمد عبید اللہؒ ہیں، انھوں نے سفر کے دوران میں حضرت خواجہ کے فرمودات و مکاشفات کو عربی میں قلمبند کیا اور وطن پہنچنے کے بعد ان کی خدمت میں پیش کیا، اور شیخ محمد شاکر بن ملا بدر الدین سرہندی سے اس کا فارسی ترجمہ بھی کرایا، مترجم نے رسالہ کے جامع و مرتب کے علاوہ دوسرے صاحبزادوں کے

بیان بھی کہیں کہیں نقل کیے ہیں، یہ رسالہ تین فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں وہ مکاشفات والہامات درج ہیں جو حرمین شریفین سے متعلق ہیں، مگر حضرت خواجہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ظہور میں آئے، دوسری فصل میں حرم مکہ کے انوار و تجلیات کا ذکر ہے، اور تیسری میں وہ مشاہدات و مکاشفات تحریر کیے گئے ہیں جو مدینہ منورہ اور وہاں سے مکہ معظمہ کو واپسی کے درمیان میں پیش آئے، اس طرح یہ پورا مجموعہ سفر حج کے انوار و برکات اور مکاشفات و الہامات کا گنجینہ ہے، ہر فصل مختلف یواقیت پر مشتمل ہے، اس لیے اس کا نام یواقیت الحرمین بھی ہے، جو اسم بامسمیٰ ہے، اس کے مطالعہ میں اہل دل کو خاص طور پر لذت و حلاوت ملے گی، حضرت معصوم رح کے مکاشفات کے اس مجموعہ کے عربی متن کا کوئی نسخہ دریافت نہیں ہو سکا مگر اس کے فارسی کے چند نسخے مختلف کتبخانوں میں موجود ہیں، جناب محمد اقبال مجددی نے دو نسخوں کی مدد سے اب فارسی متن محواشی اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں خواجہ کے حالات و کمالات کے علاوہ انکے بعض خلفاء اور رسالہ کے جامع و مرتب کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور حسنات الحرمین کے قلمی نسخوں کا عکس بھی دیا ہے،

فارسی مترجم کے حالات معلوم نہ ہونے کی بنا پر نہیں دئے جا سکے تاہم ان کے خانوادہ کے بعض اہل کمال کا مختصر تذکرہ دیا ہے، مقدمہ میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں، (۱) اس مشہور روایت کی تردید جس میں حضرت خواجہ محمد معصوم رح اور حضرت شیخ آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد رح کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر ہے۔ (۲) حضرت خواجہ محمد معصوم رح اور حضرت مجدد رح کے عہد کا مذہبی ماحول، اس سلسلہ میں پہلے وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر گفتگو کی ہے، اور دکھایا ہے کہ وحدت الوجود میں ہندو فلسفہ کی آمیزش سے صوفیہ خام کا طبقہ متاثر ہوا اور وحدت ادیان کی بنیاد پڑی ان حالات میں امام ربانی رح نے اس نظریہ کو آمیزش سے پاک کرنے کی سعی بلیغ فرمائی اور وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا،

سلسلہ میں پہلے دارا شکوہ اور اس کے ہمنوا صوفیہ کا ذکر کیا ہے، دارا شکوہ کے عقائد و خیالات تفصیل اس لئے پیش کی گئی ہے کہ اس نے وحدت الوجود اور فلسفہ ویدانت کو ملانے کی کوشش کی تھی اس کے اورنگ زیب کا بھی مفصل تذکرہ ہے، جس میں علماء و مشائخ خصوصاً نقشبندی صوفیہ سے اس کے تعلقات، حضرت مجدد رح، حضرت خواجہ محمد معصوم رح سے عقیدت مندی اور دونوں کی اولاد سے تعلقات کا ذکر ہے، مقدمہ نگار نے دکھایا ہے کہ دارا شکوہ کو صوفیہ خام کی اور اورنگ زیب کو حضرت مجدد کی سرپرستی حاصل تھی، ان بحثوں کے بعض مندرجات سے ممکن ہے بعض لوگوں کو پورا اتفاق نہ ہو مگر یہ قابل غور اور لائق مطالعہ ہیں،

دین و ادب :- مرتبہ مولانا محمد رابع ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰، قیمت چھ روپیہ، پتہ مجلس ادبیات اسلامی پوسٹ باکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

دار العلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر اپریل ۱۹۸۱ء میں ادبیات اسلامی کے موضوع پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار ہوا تھا جو بہت کامیاب رہا، اس میں متعدد عرب ملکوں کے ممتاز فضلاء و علماء کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اداروں، یونیورسٹیوں اور عربی درسگاہوں کے ارباب علم و کمال بھی بڑی تعداد میں شریک تھے اور وقت کی کمی کی وجہ سے بیک وقت اردو اور عربی کے جلسے علیحدہ علیحدہ ہوتے رہے، یہ کتاب اس مذاکرہ کی روداد ہے، اس میں پہلے اجلاس کا دعوت نامہ دیا گیا ہے جس میں سمینار کے انعقاد کی غرض، مقصد، ضرورت اور موضوع کا ذکر ہے، اور آخر میں اردو، فارسی، انگریزی اور عربی میں پڑھے جانے والے مضامین کی فہرست اور اجلاس کی تجویزیں درج ہیں، انکے علاوہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا خطبہ صدارت اور افتتاحی تقریر بھی دی گئی ہے، اول الذکر میں خاص طور پر عربی زبان و ادب میں ہندوستان کی خدمات اور اہم مصنفین کے کارناموں کا تذکرہ ہے، اور موخر الذکر میں ملک کی سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک میں علمی اور ادبی طبقہ کے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں پیش پیش رہنے کا ذکر ہے، انھوں نے ادب پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری اور مغربی ادب کو اس کی رعنائی و تازگی اور لطافت و حلاوت کے باوجود نظر انداز کرنے کے رجحان

کی پوری قوت سے مخالفت کی ہے ان کے نزدیک یہ نہ تو حسن مذاق ہے اور نہ حق پسندی کہ گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، مولانا نے دونوں خطبوں میں ادب کی تعریف اور اس کا مقصد بھی بلند آہنگی اور جوش بیان کے ساتھ بتایا ہے، اس روداد میں دو عرب فضلاء کے مضامین کا اردو ترجمہ بھی درج ہے، ان میں اسلام کے ادبی و تنقیدی نظریے، اسلامی ادب کی خصوصیات اور اس کے اہم اجزاء و عناصر کا ذکر ہے، شروع میں لائق مرتب نے اجلاس کے سلسلہ کی ضروری اور قابل ذکر باتیں تحریر کی ہیں، اور اہم شرکاء کا ذکر بھی کیا ہے، اس روداد کی اشاعت اس حیثیت سے بھی مفید ہے کہ اس سے ادب کی اہمیت، اسلامی ادب کی قدر و قیمت اور اس کی خصوصیات وغیرہ معلوم ہوتی ہیں۔

اب جن کے دیکھنے کو ......

از جناب انیس قدوائی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت بارہ روپیے پچاس پیسے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں مختلف طبقوں کے بعض نامور اشخاص کا قلمی خاکہ درج ہے، ارباب سیاست میں مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی سیرت و شخصیت کی مصوری کی ہے، سماجی و قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی خواتین میں ممردولا سارابھائی اور قدسیہ زیدی کی شرافت، وضعداری اور خلوص و دلنوازی کا ذکر ہے، بلند علمی و ادبی ذوق رکھنے والے تعلقہ داروں میں اپنے والد محترم ولایت علی بمبوق اور چودھری محمد علی کی باغ و بہار شخصیت کے جلوے دکھائے ہیں، ماہرین تعلیم اور ارباب علم و قلم میں شفیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے متعلق تاثرات قلمبند کئے ہیں اپنے ایک خاندانی ملازم حافظ جمن کا ذکر خیر بھی شوخی و ظرافت کے پیرایہ میں کیا ہے، تاثرات و مشاہدات پر مشتمل اس مجموعہ کے تیرہ مضامین میں جن اشخاص کا ذکر ہے، ان کی زندگی کے نمایاں خط و خال، اہم خصوصیات و عادات، دلچسپ حالات و واقعات اور عام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنفہ کو شوخی و ظرافت اور رعنائی تحریر اپنے والد بزرگوار سے وراثتہً ملی ہے، اسلئے اس کتاب کو پڑھ کر لوگ محظوظ بھی ہوں گے اور اس سے ان کی واقفیت میں اضافہ بھی ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ